MANSOOR BROTHERS.
No. ....
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

اپنے پیارے بھائی

میر علی احمد اور سلمیٰ کے نام ۔

آئندہ پروگرام

میں انتظار کرونگا

کرشن چندر [redacted]

انتظار

(ناول)

اعجازالرحمان ایم-اے [redacted]

اردو کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کیجئے

M... BROTHERS.
Delhi Colony, KARACHI

MANSOOR BROTHERS.
No.....................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

میں نے اپنی مسکراہٹ کو اچھی طرح خوشامد سے چکنا کر کے کونٹر پہ کھڑی ہوئی خوبصورت سندھی لڑکی سے کہا۔ . . . مجھے مدراس ایکسپریس میں تھرڈ کلاس کے لئے ایک سلیپر چاہیئے۔

سندھی لڑکی نے اپنے قریب کھڑے ہوئے گجراتی کلرک کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے اس سے کیا کہہ دیا۔ سندھی لڑکی میری طرف دیکھ کر بڑی دکھائی سے بولی " نہیں ہے "۔

اچھا ___ میں نے کہا ___ آج نہیں کل کی گاڑی میں سہی ___

نہیں ہے۔ اس نے پھر اسی مشینی لہجے میں کہا۔

پرسوں؟ میں نے پھر پوچھا۔

سندھی لڑکی نے ایک گجراتی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ جس کے کشیدے کے سرخ سرخ دائروں میں ننھے ننھے آئینے لگے ہوئے تھے۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایک لمحے میں میرا چہرہ اس بلاؤز کے ننھے ننھے سینکڑوں آئینوں میں ٹوٹ گیا سندھی لڑکی نے جلدی سے بلاؤز پر ساڑھی کو ٹھیک کیا۔ تاکہ جنسی دلچسپی قائم رہے۔ پھر پھر گجراتی کلرک کی طرف جلدی سے دیکھ کر میری طرف گھوم کے گھبرا کے بولی۔

" پرسوں بھی نہیں ہے۔ "

اب میں نے اپنی زندگی کی بہترین مسکراہٹ استعمال کی اور اس سے کہا۔

" دیکھئے میں رفیوجی ہوں "۔ سندھی لڑکی کی آنکھوں میں دلچسپی کی ایک ہلکی سی جھلک نمایاں ہوئی۔ اور گجراتی کلرک کے ماتھے پر تیوری سی پڑھ گئی۔ لڑکی نے مجھ سے پوچھا

" سندھ سے آئے ہو "

میں نے فوراً جواب دیا نہیں۔

تو بنگال سے آئے ہو؟

نہیں۔

پنجاب سے؟

نہیں۔

MANSOOR BROTHERS
No. ....
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI

تو پھر کہاں سے نکالے گئے ہو؟ سندھی لڑکی نے پریشان ہو کر پوچھا

میں بمبئی میں اپنے گھر سے نکالا گیا ہوں۔ میں نے جلدی سے کہا مالک

مکان کو پچھلے چار ماہ سے کرایہ ادا نہیں کر سکا۔

سندھی لڑکی نے کہا: دیکھئے صاحب مذاق ختم کیجئے۔ یہاں ہیں تاریخ تک کوئی برتھ خالی نہیں ہے۔ ہاں اگر معمولی دوسرے درجے کی سیٹ چاہیئے تو اس سامنے کی کھڑکی پر پوچھیئے شاید کوئی جگہ مل جائے۔

اتنی لمبی چوڑی تقریر کے بعد سندھی لڑکی کو ایسا معلوم ہوا گویا ایک دم وہ ماؤنٹ ایورسٹ کی ساری چڑھائی چڑھ گئی۔ اس کا دم پھول گیا، اور وہ ہانپ کر ڈبے میں سے لپ اسٹک ٹٹولنے لگی۔ میں معمولی درجے کے کاؤنٹر پہ چلا گیا۔

وہاں معمولی دوسرے درجے کے کاؤنٹر پر ایک غیر معمولی خوبصورت دلکش لڑکی کھڑی تھی۔ ماتھے پر چمکتا ہوا کُم کُم۔ گول گول گندمی چہرے پر عفت کی چھاپ جیسے اصلی تمباکو پہ درتیمیا کی چھاپ ہوتی ہے۔ مجھے کاؤنٹر کے قریب آتے دیکھ کر وہ بڑی دلکش انداز سے ہنسی اور مجھے یہ دکھایا کہ اس کے دانت واقعی بہت ہی سفید اور موتیوں کی سی جلا لئے ہوئے ہیں پھر اس نے میری طرف جھک کے کہا "آج کی مدراس ایکسپریس میں تو کوئی جگہ نہیں"!

کل؟ —— میں نے بڑی رکھائی سے پوچھا۔

کل بھی نہیں! اس نے ایسے دلکش لہجے میں کہا گویا مجھ پہ بڑا احسان کر رہی ہے۔

پرسوں؟ میں نے ذرا ترش رو ہو کے کہا۔

پرسوں کیا بائیس تاریخ تک سب جگھیں بک ہیں۔ وہ مسکرا کے بولی اس کی آواز اس قدر میٹھی اور شہد کی طرح شفاف تھی۔ کہ آدمی اسے ڈبل روٹی پہ لگا کے کھا سکتا تھا۔ مجھے چونکہ اس وقت ڈبل روٹی نہیں بلکہ ایک سیٹ کی تلاش تھی۔ اسلیئے میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اور سیدھا ڈویژنل ٹریفک مینجر کے پاس چلا گیا۔

ڈویژنل ٹریفک مینجر ایک مرہٹہ سردار کی طرح بڑی مضبوطی سے اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے لکھنو کی بالائی کے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کے خوشنما گنجے سر کے اوپر ایک بلب چمک رہا تھا۔ جس کی روشنی اس کے سر کے گرد ایک بالہ سا بنا رہی تھی۔ جس سے اس کی ساری شخصیت کے گرد مسیحیت کا تقدس سا پھیلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے کہا۔

، مجھے تریچور آج ہی جانا ہوگا۔

تو جائیے۔

مگر کوئی سیٹ نہیں ملتی۔

وہ بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ تو میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تریچور میں جنوبی ہند کے ممتاز ادیبوں کی ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ اور میں اس کا صدر ہوں اگر میں آج یہاں سے نہ چلا تو وہ بے چارے میری صدارت سے محروم رہ جائیں گے۔

مرہٹہ سردار نے گرج کر کہا۔ چپڑاسی !

چپڑاسی اندر آیا۔

ہیڈ کلرک کو بلاؤ۔

ہیڈ کلرک اندر آیا

آپ کو مدراس ایکسپریس میں ایک سیٹ دے دو۔

سیٹ نہیں ایک برتھ۔ میں نے لقمہ دیا۔ تین دن اور دو رات کا سفر ہے۔

ایک برتھ! مینجر نے کڑک کر کہا۔

ہیڈ کلرک نے اپنی چندھیائی ہوئی تنگ آنکھوں سے میری طرف سے گھور کے دیکھا اور بولا یس سر! باہر نکل کے ہیڈ کلرک نے ایک پرچہ دیا۔ اور کہا۔ اسے بکنگ کونٹر پر لے جائیے، ہو جائے گا۔

جب میں واپس سندھی لڑکی کے پاس پہنچا تو ایک گجراتی کلرک بڑے گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ "وہ سیٹ کا رزرویشن کے لئے فون آیا تھا" مجھے دیکھتے ہی سندھی لڑکی بے حد خفا ہو کے بولی" جب میں نے آپ سے ایک دفعہ ۔۔۔"

اس سے آگے میں نے اسے بات ہی نہیں کرنے دی۔ جلدی سے پرچہ اسکے ہاتھ تھما کے خوبصورت دکشنی لڑکی سے کہنے لگا ہیلو۔ سیٹ تو مل گئی ہے اب ذرا رات کے کھانے کے لئے ایک تار دے دو، دکشنی لڑکی نے منہ پھیر لیا بائیس تاریخ کی بکی ۔۔۔۔۔

سندھی لڑکی نے پرچہ دیکھ کے بڑی حیرت سے پوچھا۔ آپ کو سیٹ کیسے مل گئی؟

حیرت تو مجھے بھی تھی، مگر چپ رہا۔ جیسے یہ بھی کوئی سرکاری راز ہو، اور در اصل یہ سرکاری راز ہی تو تھا۔ بے چارہ ٹریفک منیجر جانے مجھے سرکاری ادیبوں کی کانفرنس کا

صدر رہا جانے کیا سمجھ کر مجھے سبعت دے بیٹھا، اگر اسے کہیں سے پتہ چل گیا تو یہ ترقی
پسند ادیبوں کی کانفرنس ہے تو مدراس ایکسپریس تو کیسی مال گاڑی میں بھی بیٹھنے نہ دیتا!
خاص کر اس نئے سرکلر کے بعد جیسا سنا ہے سرکار نے ہر محکمے کو ترقی پسند ادیبوں سے
خبردار رہنے کو کہا ہے۔ اور یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ اس سرکلر کے بعد کوئی سرکاری ملازم ترقی
پسند ادیبوں کی انجمن کا ممبر بھی نہیں ہو سکتا (سوائے سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمیوں کے)

جب سیٹ بک ہو گئی تو میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ایک بجا تھا
مدراس ایکسپریس دو بجے چھوٹتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے ڈبے میں جا کے
برتھ پر بستر جمایا۔ دو ر قیلولہ کرنے کی نیت سے سو گیا۔

جب اٹھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ ایک ہم سفر نے مجھے جھنجھوڑ کے جگایا۔
کیونکہ گاڑی اس سٹیشن پر کھڑی تھی۔ جہاں کھانے کے لئے تار دیا تھا۔ ایک آدمی
ڈبے کے سامنے ٹفن کیریر لئے کھڑا تھا۔ ٹفن کیریر یہ کھولا تو زندگی میں پہلی بار جنوبی
ہند کا کھانا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ پہلے ڈبے میں رسم تھا ٹماٹر کے سوپ کی
طرح کھٹا پھر سامبر جس میں دال اور سبزی۔ اور کیا کچھ نہیں تھا۔ پھر دو طرح کا دہی
پھر آخر میں چاول اور ایک چھوٹی سی کٹوری میں پکوڑی اور کیلے کے پتے میں دو جام کا
امبڈو۔ اور دو پاپڑم جنہیں ہم لوگ اپنے ہاں صرف پاپڑ کہتے ہیں۔ یہ نفیس اور ہلکا
پھلکا کھانا کھا کے پھر میں سو گیا۔ اور جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بمبئی کا صوبہ بہت
دور پیچھے رہ گیا ہے اور اب ریل گاڑی پھپ پھپ کرتی ہوئی جنوبی ہند کی وادیوں
میں سے گزر رہی ہے۔

MANSOOR BROTHERS
No. ....

میں اس اجنبی دیس میں پہلی بار آیا تھا۔ اس لئے کھڑکی سے سر لگائے برابر باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ بدلا ہوا منظر جو بمبئی سے مختلف ہے۔ گو مغربی گھاٹ کے کوہستانی سلسلے یہاں بھی تھے۔ لیکن بمبئی سے کس قدر مختلف کیونکہ جنوبی ہند خط استوا سے بہت نزدیک ہے۔ اس لئے پھل، پھول اور درخت اس قدر بدل گئے تھے۔ لیکن بدل جانے پر بھی بالکل غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گو میں پہلی بار ادھر آ رہا ہوں۔ پھر بھی جیسے میں نے ان تمام مناظر کو اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ یکایک کرناٹک کے پہاڑی علاقے میں میں نے بھیکڑ کی جھاڑیاں دیکھیں۔ بھیکڑ جو کشمیر کے نچلے کوہستانی علاقے یعنی میرپور اور کوٹلی میں پائی جاتی ہے۔ یہاں بھی موجود تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرا ذہن ان دور دراز بدنصیب وادیوں میں گھومنے لگا۔ جہاں کبھی ماہیئے کے گیت تھے۔ اور بندوق کی گولی ہے۔ جہاں کبھی لوگ محبت کرتے تھے۔ اور آج نفرت کرتے ہیں جہاں کبھی کسان ہل چلاتے تھے۔ اور آج خندقیں کھود رہے ہیں۔ جہاں ہندوستان اور پاکستان بدیشی سامراجیوں کی کٹھ پتلیوں میں کر نیا سیتی شہنشاہیت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے میرا ذہن ادھر منتقل ہو گیا۔ جہاں زندگی اور موت کی لڑائی جاری ہے۔ پھر میں جنوبی ہند کی اس دلفریب وادی میں لوٹ آیا۔ اور میں نے سوچا یہاں تو امن ہے۔ یہ منظر کس قدر پرسکون ہے۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑ، کہیں کہیں، گول گول چوٹیوں کے نیچے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے پہاڑ نے دھوپ سے بچنے کے لئے انگریزی ٹوپی پہن رکھی ہو۔ دور میلوں تک پھیلا ہوا جنگل دھان کے کھیت، کہیں پر دھان کی ڈھیری، تو کہیں پر کٹائی، ایک جگہ دھان سبز ہے۔ تو دوسری جگہ پیلا ہو چکا ہے۔

کاٹا جا رہا ہے۔ پھر پہاڑی علاقہ، اور ڈھلوانیں، جھیکر کی جھاڑیاں، دھوپ میں ستستاتی ہوئی گذرجاتیں۔ جھیکرا اور کھجور اور کھجور کے درختوں میں گھومتی ہوئی نیلی نرم رو ندیاں اور لانبی دریائی گھاس میں چرتے ہوئے بیل بکریوں کے ریوڑ، انگوروں کے باغ، جنگلی پینڈھوں پہ ناگ پھنی کی جھاڑیاں کہیں کہیں کوئی پرانا مندر اور گہری سبز آنکھوں والے تالاب جتنا بڑا مندر اتنا ہی بڑا تالاب۔ شمالی ہند کا تکونہ مندر نہیں۔ جنوبی ہند کا پرشکوہ مندر نیچے سے اوپر تک ایک جنگل کی طرح پھیلتا ہوا اپنے فن تعمیر اور سنگتراشی میں ایک پہاڑ کی سی عظمت اور اس کی خود رو نباتات کی دلکشی اور تنوع لئے ہوئے۔ شمالی ہند کا مندر بڑا اچھوٹا گھٹیا اور کمینہ ہوتا ہے۔ جنوبی ہند کا مندر ڈرا اوری رنج کا عکس ہے۔ جو جنگل میں پلی بڑھی اور شکار کھیلتی رہی وہ جنگل کی وسعت اور اس کی عظمت اور کھلے آسمان کا دل پہچانتی ہے۔ اور اسے اپنے مندر کی تعمیر میں سمو دیتی ہے۔ کیونکہ مندر جنوبی ہند کا شروع ہی سے جنوبی ہند کی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اور اس کی روز مرہ زندگی کا محور مندر جنوبی ہند میں بیسویں صدی تک بھی صرف پوجا کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا رہا۔ بلکہ اسے دوسرے سیاسی اور سماجی کاموں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مندر نارچ گھر تھا۔ کتھا کلی کی روایت کا سرپرست راجہ لوگ مندر میں ایک دوسرے سے عہد و پیمان کرتے تھے۔ لوگ مندروں ہی میں شادیاں کرتے تھے۔ اور جنگ کے وقت مندر سے بیڑا اٹھا کے جاتے تھے۔ مندر کے تالاب میں لوگ اشنان کرتے تھے۔ اور عورتیں گھر کے کام کاج اور پینے کا پانی بھی یہیں سے لیجاتی تھیں۔ جنوبی ہند میں مندر بہت دیر تک سماجی زندگی کا

ہو رہا ہے۔ اور شاید اسی لئے ابھی جنوبی ہند کی زندگی اتنی دیر تک برہمنیت کے قدیم افسونوں میں گرفتار رہی۔

کٹیڑپہ سے نندپور تک پہونچتے پہونچتے یہ دلکش قدرتی مناظر جنگلات کے ایک وسیع سلسلے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ صوبہ مدارس تک پھیلتا ہے۔ اور ریاست حیدرآباد کی حدود میں شامل ہو جاتا ہے۔ نندپور کے مقام پر میرے ڈبے میں ایک رومن کیتھولک پادری اور ایک ان کا دیسی ساتھی داخل ہوئے۔ رومن کیتھولک پادری کا گول گول سرخ چہرہ بالکل بچوں کا سا تھا۔ اور اس کے چہرے پہ ایک چمکتی ہوئی ہشاش بشاش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور اس کا دوسرا ساتھی۔ سانولے رنگ کا لمبا، چوڑا، پچکے ہوئے گالوں والا تھا۔ آنکھوں سے بے چینی اور عیاری عیاں ہوتی تھی۔ اور میری سیٹ کی طرف آتے آتے بولا۔ میں جانتا ہوں یہ برتھ آپ کی ہے مگر ہمیں صرف چار اسٹیشن آگے جانا ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم لوگ یہاں بیٹھ جائیں؟ یہ اس کے بعد بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور پھر باہر سے بینڈ باجے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں نے سوچا ضرور کوئی بہت بڑا راہب ہے جس کے لئے یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو چند سرکاری قسم کے لوگ اور بہت سے سپاہی نظر آئے، ماتھا ٹھنکا کہیں یہ لوگ اپنے ہی استقبال کے لئے تو حاضر نہیں ہوئے مگر یہ سوچ کر اطمینان ہو گیا کہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا۔ کہ ہم لوگ فیڈ سبا کے گرفتار کئے جائیں۔ اسلئے اب میں نے ذرا دوسری طرح سے مسکرا کے

پادری سے پوچھا" یہ لوگ آپ کو رخصت کرنے آئے ہیں" پادری زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا۔ واہ واہ یہ تو خوب مذاق رہا "تری مینڈوس" پادری عجیب طرح کی انگریزی بولتا تھا۔ گوٹ کو گوٹ کہتا تھا اور ڈال کو دال اسی لئے۔ (TREMENDOUS) کو "تری مینڈوس" کہتا تھا، اور وہ بھی اس طرح منہ پھیلا کے گویا بہت بڑا لقمہ منہ میں ڈالے ہوئے ہے۔ یہ پادری انگریز تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے دل میں سوچا، مگر اس وقت پوچھنے کا موقع نہ تھا۔ بات بینڈ باجے کی ہو رہی تھی۔ دبلے، ناٹے دیسی پادری نے بتایا کہ بینڈ باجا والا اس صوبے کے خوراک کے وزیر کے لئے ہے۔ یہ سپاہی، یہ سرکاری ملازم سب انہیں کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ یہ پھولوں کی ٹوکریاں، اور دوسری چیزیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی وزیر صاحب کے ہمراہ "زیادہ خوراک اگاؤ" کی مہم کے سلسلے میں تحقیقات کے لئے بھیجی جا رہی ہیں۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر وزیر صاحب کو اپنے قریب کے ایک ڈبے میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ آس پاس درجنوں پولیس کے سپاہی تھے کبھی عوام ہوتے تھے۔ آج ان کے گرد وہی پرانے حاکم تھے۔ وہی پھولوں کی ٹوکریاں تھیں۔ وہی پہرے۔

میں نے بڑے پادری سے کہا "فادر، میں نے کچھ زیادہ غلط نہیں سمجھا۔ یہ بینڈ باجا بھی ایک پادری کو چھوڑنے آیا ہے۔ گاندھیائی مت کے ایک بڑے پادری کو"

دونوں پادریوں نے میری طرف بڑے زور سے گھورا، میں مسکرا دیا۔

MANSOOR BROTHERS.
No.............
LIBRARY
KARACHI
Delhi Colony.

تو بڑا پادری پھر قہقہے لگا کے ہنسنے لگا۔

"نری ہینڈوسں"

میں نے پوچھا۔ گاڑی یہاں کتنی دیر سے رکتی ہے؟

دیسی پادری بولا —— صرف پانچ منٹ رکتی ہے۔

اب تو پندرہ منٹ سے اوپر ہو گئے۔ میں نے جھلا کے کہا۔

چلے گی، چلے گی، گھبرائیے نہیں —— اس نے جواب دیا۔

ایک بڈھا آدمی جس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بالکل سفید تھے، اور سانولے چہرے پر بڑی بڑی درویشانہ آنکھیں تھیں، گلاب کے پھولوں کی ٹوکری لئے ہمارے پاس آیا۔ اور میری کھڑکی سے اندر جھانک کے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ کیسے دیئے یہ گلاب کے پھول؟

بڈھے آدمی نے جلدی سے ٹوکری پیچھے ہٹالی۔ اور میری طرف ملامت بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیگم اندر ہے"

دیسی پادری نے جلدی سے کہا۔ "نہیں وہ اگلے ڈبے میں ہے۔"

بڈھا جلدی سے کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دوسرے ڈبے کی طرف چلا گیا"

میں نے بڑی حیرت سے پوچھا دیسی پادری کی طرف دیکھ کے پوچھا

"یہ کیا ماجرا ہے"

دیسی پادری نے کہا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اگلے چار سٹیشنوں تک

بیان نہیں ہو سکتی۔ اسلئے مختصر کہتا ہوں۔

اس بڈھے کا نام یاسین ہے۔ یہ راجہ پتیم پور کے باغات میں مالی کا کام کرتا تھا۔ یہاں نندپور کے مقام پر جو تم سینکڑوں میلوں تک پھیلے ہوئے جنگل دیکھتے ہو یہ سب جنگلات راجہ پتیم پور کی جاگیر میں شامل ہیں۔ نندپور میں یا تو یہ جنگل ہیں جن سے لکڑی کاٹ کر باہر بھیجی جاتی ہے۔ اور یہاں پر سنگتروں کے چند باغات ہیں جنوبی ہند میں ان سے بہتر سنگترے کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ تم انھیں کھاؤ تو ناگپور کے سنگتروں کو بھول جاؤ۔

یاسین برسوں سے انھیں باغات میں مالی کا کام کرتا تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ ان باغوں میں کام کرتا تھا۔ وہ راجہ پتیم پور کی وفادار رعایا تھے۔ یاسین کو باغ کے کنارے ایک جھونپڑا۔ اور تھوڑی سی زمین بھی راجہ صاحب نے کاشت کے لئے دے رکھی تھی۔ زمین سے دھان ہوتا تھا۔ جھونپڑے کے آس پاس کی بیلوں سے ترکاری مل جاتی تھی۔ اور پھل پھلاری باغ سے مل جاتی تھی۔ جہاں یاسین دن رات کام میں لگا رہتا تھا۔

یاسین کی بیوی عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ اس کا کھانا اس کی جوان بیٹی بیگم پکاتی تھی۔ اور جھونپڑے کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی تھی۔ بیگم کو یاسین نے بچپن سے خود ہی پالا تھا۔ کیونکہ جب یاسین کی بیوی مری اس وقت بیگم کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ میں نے ان دنوں یاسین سے کہا تھا کہ وہ ننھی لڑکی کو ہمارے کانونٹ میں دیدے۔ یہاں اس کی تعلیم اور پرورش بھی اچھی ہو جائے گی۔ مگر اس کمبخت بڈھے نے میری ایک نہ مانی۔ یہ بڈھا پکا مسلمان ہے۔ اس وقت بھی مجھ سے

کہنے لگا۔ پادری صاحب۔ میری بیوی کی ایک ہی تو نشانی میرے پاس رہ گئی ہے۔ اسے بھی آپ کو دے دوں تو میرے پاس کیا رہ جائے گا۔ آپ میری بیٹی ہی نہیں۔ میرا ایمان بھی مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔"

تیمور صاحب۔ لیلین بیوی ہی نہیں اپنی بیٹی کی پرداخت کی۔ وہ اسے ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا۔ باغ میں جاتا تو بھی اسے کندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماتا کا جذبہ صرف ماں میں ہوتا ہے۔ میں نے تو بیگم کے باپ میں بھی اس جذبے کو بیدار دیکھا ہے۔

بیگم جوان ہو کر بڑی طرحدار نکلی۔ آس پاس کے گاؤں میں بھی کوئی ایسی خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ جب پھول کھلتا ہے تو دور تک اس کی خوشبو جاتی ہے۔ بیگم کے حسن کا شہرہ راجہ کے کانوں تک بھی پہنچا، رال بھی ٹپک پڑی۔ لیکن وہ دل مسوس کے رہ گئے۔ اب ان کی عمر اسی برس سے اوپر ہو گئی تھی۔ اب پھول کو توڑنے اور اس کی خوشبو سونگھنے کی سکت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ اسلئے وہ بیچارے دل تھام کے رہ گئے۔ وہ دل جس کی دھڑکن اب کوئی دم میں بند ہوا چاہتی تھی۔

بیگم اپنے باپ کے ہمراہ باغ میں کام کرتی تھی ———— وہ اپنے کھیتوں میں بھی مردوں ہی کی طرح ہل چلایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اب وہ اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال خود کیا کرتی۔ کیونکہ اب اس کا باپ بڈھا ہو چلا تھا۔ اور اب اس سے اتنی محنت بھی نہیں ہوتی تھی۔ بیگم نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ جب تک اس کا بڈھا باپ زندہ ہے۔ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔ جب کبھی لیلین نے اس کے سامنے شادی کا نام لیا۔ وہ خفا ہو کے اس سے لڑ پڑی۔ اور روٹھ گئی کئی دن

اس لیے لرزتی رہتی ۔ بڑی جذباتی لڑکی تھی ۔ اگر کانونٹ میں آجاتی تو اس وقت بڑی اچھی ماہر ہوتی ۔ مگر افسوس صلیب اس کی قسمت میں نہ تھی ۔ بیگم کے سارے اطوار مردانہ تھے ۔ مگر ایک بات اس میں ایسی تھی جس سے عورتوں کی جمالی نسائیت کا بھرپور اندازہ ہوتا تھا ۔ اسے پھولوں سے عشق تھا ۔ اور پھول بھی گلاب کے ۔ اس نے اپنے جھونپڑے کے ارد گرد چاروں طرف گلاب کی جنگلی بیلیں لگا رکھی تھیں ۔ اور جھونپڑے کے باہر بھی اپنے چھوٹے سے باغیچے میں طرح طرح کے گلاب کے پھول گملوں میں سجائے تھے ۔ ان کی قلموں کے لانے کے لئے بیگم نے دوسرے دوسرے باغات کے مالیوں کی کیا کیا خوشامدیں نہ کی تھیں ۔ کتنی جانفشانی سے بیگم نے گلاب کے ان خوبصورت پھولوں کو اپنے جھونپڑے کے ارد گرد سجایا تھا ۔ یاقوت کی طرح سرخ پھول اور شفق رنگ گلاب ، گلاب جن میں کنوار سے ہونٹوں کی لالی تھی ۔ اور گلاب جن کی رنگت میں صبح کا سونا گھلا ہوا تھا ۔ چاندنی رات کی برف کی طرح سفید اور معصوم گلاب ، اور پیلے پیلے گلاب ـــــ اپنے قلب میں ہجر کی زردی اور تپش لئے ہوئے گلاب جن کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ دور دور تک دھان کے کھیتوں میں پھیل جاتی تھی ۔ اور گلاب جن کی خوشبو محبت کے خاموش ساز کی طرح مدھم مدھم گہری اور پر اسرار تھی ۔ وہ خوشبو جو مشکل سے ایک چہرے سے اڑ کر دوسرے چہرے تک پہنچ سکتی ہے ۔ ایسے سینکڑوں ہی گلاب تھے ۔

. . . میں بھی

گلاب تھے جو بیگم کے باغیچے میں کھلے ہوئے تھے ۔ جو بیگم کے سیاہ بالوں کی زینت تھے ۔ جو اس کے گلے کا ہار تھے ۔ اس کے جوڑے کی دلنوازی کا تبسم . . . . میں بھی

گلاب بیگم کی کمزوری تھی۔ اور لیسین جانتا تھا کہ یہ کمزوری خود اس نے بیگم کے مزاج میں پیدا کی ہے۔ بچپن ہی سے اس نے اپنی بیٹی کو پھولوں سے محبت کرنا سکھایا تھا۔ وہ اس کے لئے باغیچے میں سے چن چن کر اچھے اچھے پھول لایا کرتا تھا جن سے وہ گھنٹوں کھیلا کرتی تھی۔ اب وہ پھولوں سے کھیلنے کا زمانہ گذر گیا۔ لیکن پھولوں سے محبت اب بھی باقی رہی تھی۔ وہ اب اس کا جھونپڑا گلاب کے کھلے ہوئے غنچوں سے اس قدر بھرا پڑا معلوم ہوتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا کہ کوئی مدراسی گاؤں نہیں ہے۔ ایرانی مرغزار ہے۔

ایک روز راجہ پتھم پور کے ولی عہد اپنے دوستوں کو لے کر نند پور شکار کے لئے پہنچے اور ان کے اپنے جنگل تھے۔ اپنے باغ تھے۔ رعایا بھی اپنی تھی۔ چاروں طرف اپنی ملکیت تھی۔ ڈر کسی کا نہیں تھا۔ اسٹیشن سے ایک طرف سائڈ ٹریک میں ان کا سپیشل سیلون لگا دیا گیا۔ اور ولی عہد صاحب ہنکیوں کو لے کر شکار کے لئے نکل گئے۔ دن بھر انہوں نے شکار کھیلا۔ چیتے، ریچھ، ہرن اور سور، بہت سے جنگلی جانور ہاتھ لگے۔ ہنکیوں میں سے بھی صرف دو جانوں کا نقصان ہوا۔ ایک ہنکئے کو تو چیتے نے پھاڑ ڈالا۔ دوسرا ہنکیا اور جنگلی سور کے تھتھے چڑھ گیا اس نے اپنی سخت تھوتھنی سے اس کے پیٹ کو چیر کے اس کی آنتیں باہر نکالدیں اور پھر غصے میں آکر اس نے اس بے چارے کسان کو تھوتھنی سے اچھال کر الٹا گرا دیا۔ اس وقت سور پہ گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ مگر مرتے مرتے بھی اس کمبخت نے اس ہنکئے کو کمر سے گردن تک ادھیڑ کے رکھ دیا۔ وہ راجہ صاحب کا بڑا پرانا ہنکیا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ شکار میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بلکہ

تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیتے کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ اور دو چار بھنگے مفت میں جنگلی جانوروں یا کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اسلئے آج کا دن تو اچھا رہا۔ کوئی پندرہ کے قریب جانور ہاتھ آئے۔ جن میں تین چیتے تھے۔ اور اپنی طرف سے کل دو ہنکیوں کی جان گئی۔

ولی عہد خود بڑے خوش خوش اپنے سیلون کو لوٹے۔ غسل کے بعد مئے کا دور رہا۔ مئے نوشی کے دوران میں جب ولی عہد کی آنکھیں گلابی ہو گئیں اور زبان پہ لکنت سی پیدا ہونے لگی۔ تو کنور بیر سنگھ دست بستہ عرض کی۔

حضور ذرا سنبھلئے، میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ولی عہد اپنی کرسی سے اٹھے، اور کنور بیر سنگھ کو لے کے اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ایک لڑکی کو دیکھا جسے وہ دیکھکر وہیں ٹھٹک گئے۔ پھر انہوں نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور بیر سنگھ سے کہا۔ کنور جی یہ کون ہے، اور ہمارے کمرے میں کیا کر رہی ہے۔

کنور جی نے مسکرا کے کہا، حضور یہ بھی آپ کی رعایا ہی ہے۔ آپ ہی کی ملکیت ہے۔ اس کا نام بیگم ہے۔ اس کا باپ حضور کے باغات میں مالی کا کام کرتا ہے۔

ولی عہد بڑے شرمیلے تھے۔ ان کے متعلق ساری جاگیر میں یہ مشہور تھا کہ ولی عہد عورتوں کی طرف نگاہ بھر کے نہیں دیکھ سکتے۔ راجہ صاحب کے مشورے سے ولی عہد کے دوستوں نے کئی بار انھیں جنس لطیف کی "ضیافت" کے لئے اکسایا لیکن ہر بار ولی عہد نے ٹال دیا۔ تاچار راجہ صاحب نے تنگ

آگے ولی عہد کی منگنی کردی تاکہ یہ دوسرے ولی عہدوں کی طرح نامرد ہی ثابت نہ ہوں۔ اسی فکر میں ان کی جان گھلی جا رہی تھی۔ بھلا ہو کنور بیر سنگھ کا انہوں نے راجہ صاحب کے سامنے اس شکار کا پروگرام رکھا۔ اور اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔ راجہ صاحب راضی ہو گئے۔ اس لئے اب یہ لڑکی ولی عہد کی خواب گاہ میں موجود تھی۔ ولی عہد بولے تمہیں معلوم ہے اگلے ماہ میری شادی ہونے والی ہے۔

کنور بیر سنگھ ہنس کر بولے۔ تو اس میں کیا ہے حضور۔ ذرا ریہرسل ہو جائے گی ——— پھر اس نے لہک کر کہا۔ ذرا اوپر نگاہ اٹھا کر تو دیکھئے حضور! کیا خوبصورت پھول لایا ہوں۔

ولی عہد نے نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ اور یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ بیگم بے حد خوبصورت تھی۔

MANSOOR BROTHERS.
No.......................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

MANSOOR BROTHERS.
No.........................
LIBRARY
Delhi Colony KARACHI.

ولی عہد کے پروگرام میں سندپور کا قیام دس دن کا تھا۔ ولی عہد وہاں سات دن رہے۔ اور سات دن تک یاسین سٹیشن پر اپنی بیٹی سے ملنے کیلئے آتا رہا لیکن اسے کسی نے اپنی بیٹی سے ملنے دیا وہ اس روز بھی روزمرہ کی طرح اپنے باغ میں کام کر رہا تھا۔ کہ کسی نے اسے آ کے کہا۔ تیری بیٹی کو راجہ صاحب کے آدمی اٹھا کے لے گئے ہیں وہ تالاب سے نہا کے واپس آ رہی تھی۔ کہ میں نے اس کی چیخیں سنیں۔ میں نے دیکھا راجہ صاحب کے آدمی اسے پکڑ کے کندھے پہ اٹھا کے گھوڑے پہ سوار کرا کے چلے گئے۔ بیگم تیرا نام لے لے کر رو رہی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ تو میری بات مانے تو چپ ہو جا، زیادہ شور مچائے گا۔ تو نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

مگر یاسین نے دوسرے مالی کی بات نہیں مانی۔ اور وہ سندپور کے سٹیشن پہ چیختا چلاتا ہوا آیا اور سپیشل سیلون کے ارد گرد چکر کاٹتا رہا۔ مگر سپیشل سیلون کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ اور اس لیئے باہر کی چیخ اندر نہ جا سکی۔ اور اندر کی سسکی باہر سنائی نہ دے سکی۔ اور اس کے بعد جب یاسین نے بے تاب ہو کر بہت شور مچایا۔ تو کنور رنبیر سنگھ اور راس کے آدمیوں نے یاسین کو خوب اچھی طرح پیٹا۔ اور اسے ادھ موا کر کے

اس کی جھونپڑی میں ڈال آئے۔

وہاں لیسین دو۔ روز تک بے ہوش پڑا رہا۔ مگر مرا نہیں، تم جانتے ہو یہ کسان لوگ بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔

ان کی ہڈی بڑی اکڑی اور مضبوط ہوتی ہے۔ بڈھا بچ گیا۔ مگر اس کا دماغ چل گیا۔ چنانچہ چھٹے روز جب بڈھا پھر سپیشل سیلون کے سامنے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گلاب کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری تھی۔ اور وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بار بار کہہ رہا تھا، میری بیگم کو میرے سامنے لادو میں اسے گلاب کے پھول دوں گا۔ پھر وہ سپیشل سیلون کی ہر کھڑکی کے سامنے جا کے کہتا بیگم کیا تو اندر ہے۔ دیکھ میں تیرے لئے گلاب کے پھول لایا ہوں

اس دن سے یا سین کا دستور ہو گیا۔ کہ دن بھر سپیشل سیلون کے گرد چکر لگاتا رہتا اور رات کو اپنے جھونپڑے میں جا کے پڑ رہتا۔ اور جب صبح ہوتی تو پھر پھولوں کی ٹوکری ہاتھ میں لئے سٹیشن پر آموجود ہوتا۔ راجہ صاحب کے ملازم اسے مار تے پیٹتے۔ گالیاں دیتے دھمکاتے اس کا مذاق اڑاتے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ کسی بات کا برا نہ مانتا۔ بلکہ بڑی لجاحت سے، بڑی ملائم آواز میں نوکروں سے کہتا۔ بیگم کو اندر سے بلا دو۔ میں اس کو یہ پھول دوں گا۔ اور پھر چلا جاؤں گا۔" یہ سن کر راجہ صاحب کے نوکر پھر زور زور سے ہنسنے لگتے۔

ساتویں روز سپیشل سیلون بھی چلا گیا۔ اور اس کے ساتھ لیسین کی زندگی کی آخری امید بھی چلی گئی۔

پادری چپ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی آہستہ آہستہ نندور کے پلیٹ فارم سے باہر نکل رہی ہے۔ اور وہ سفید ڈاڑھی والا بڈھا اپنے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کی ٹوکری لئے پلیٹ فارم کے آخری سرے پر سر جھکائے کھڑا ہے۔

پادری نے منہ پھیر کر گلوگیر آواز میں کہا۔ اس دن سے یہ بڈھا ہر روز یہاں آتا ہے۔ اور ہر گاڑی کے ہر ڈبے میں جھانک کے پوچھتا ہے ــ "کیا بیگم اندر ہے"؟ میں اس کے لئے پھول لایا ہوں"

ڈبے میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ گاڑی اب نندور کے آگے نکل کے گھنے جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔ گورے پادری نے انگلی کے اشارے سے مجھے بتایا کہ یہی راجہ بٹیم پور کے جنگلات ہیں۔ بہت دور تک ادھر مغرب میں نظام حیدر آباد کی ریاست کے اندر دور پہاڑی چوٹیوں کے پرے تک یہ جنگلات چلے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں جنگلی جانور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ جانور اس قدر دلیر ہیں

کہ آس پاس کے گاؤں سے۔ اور ایک روز تو اس اسٹیشن سے اسٹیشن ماسٹر کو اٹھا لے گئے۔ بڑے خونخوار چیتے ہوتے ہیں اس جنگل کے

میں راجہ صاحب کے جنگلوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی انسانی آبادیوں کے گرد میلوں تک پھیلے ہوئے خونخوار جنگل، یہ صوبہ مدراس سے حیدرآباد تک پھیلے ہوئے وسیع جنگل جن کے بیچ میں ایک پھول قید ہے۔ کیا یہ پھول کبھی آزاد نہ ہو سکے گا۔ میں نے نگاہ اٹھا کے ان وسیع جنگلوں کی طرف دیکھا۔ جن کے بیچ میں گاڑی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ یہ جگہ نشیب پر تھی۔ جنگل مغرب کی سمت اونچے اور اونچے پہاڑیوں پہ پھیلتے چلے جا رہے تھے راجہ صاحب کے خوفناک جانوروں والے جنگل، پہاڑیوں کے اس طرف حیدرآباد کی سرحد تھی۔ وہاں بھی یہ جنگل پھیلتے ہوئے چلے گئے تھے۔ ان سے پرے تلنگانہ تھا۔ اور میں نے سوچا ایک دن یہ پھول ضرور آزاد ہوگا۔ تلنگانے کے بات اور شاعر کے دل ضرور اس جنگل کو فتح کریں گے جو انسان کی روح کے ارد گرد چھایا ہے۔

۱

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گورا یادوری بڑے افسوسناک لہجے میں کہنے لگا۔ آج کل شکار میں مزہ نہیں رہا۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔
شکار کے لئے ہنکئے نہیں ملتے۔ پہلے بہت ملتے تھے۔ ایک دُگنے داموں پر بھی بہت کم ہنکئے ملتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو ہنکیوں کے بغیر شکار کا لطف نہیں آتا۔ اب کسانوں کو اپنی جان پیاری ہو گئی ہے۔ وہ شکار پر ہنکیوں کا کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

میں نے پوچھا۔ فادر تمہیں شکار کا بہت شوق ہے؟
اس کا گول گول بچوں کا سا چہرہ کھل اٹھا۔ بولا۔ "تری مینڈوس"
میں نے کہا، فادر تم فرانسیسی ہو کہ اطالوی؟
وہ بولا۔ میں ڈچ ہوں، مجھے یہاں آئے ہوئے تیس سال ہو گئے تیس سال اسی حلقہ میں گزر گئے۔ میں نے گاڑی سے باہر اشارہ کیا وہ سر ہلا کے بولا ہاں مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ یہاں شکار بہت اچھا ملتا ہے۔ ریچھ، شیر، چیتے، سور، ہرن ہر طرح کا شکار ملتا ہے۔ مگر نہیں ملتا ہے تو صرف ایک ہاتھی نہیں ملتا ہے۔ اس علاقے میں۔ میں نے کہا فادر، تم غلط کہتے ہو، ہاتھی تو یہاں بھی ملتا ہے۔ مگر تم نے کبھی اسے شکار کرنے کی کوشش نہیں کی، تم ہمیشہ غریب آدمیوں کا شکار کرتے رہے اور ہاتھیوں کو جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا۔ ورنہ ہاتھی تو ہندوستان ہی میں ملتا ہے۔ مگر وہاں اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سفید ہاتھی بڑا متبرک ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ ایشیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ سفید ہاتھی نہ ملتا ہو، حد تو یہ ہے کہ ایک

یہ سفید ہاتھی، عرب، عراق، سیریا، فلسطین کے ریگستانوں میں بھی ملنے لگا ہے۔ جہاں جہاں تیل کے چشمے ہیں۔ لوہے کی کانیں ہیں، ربڑ اور چائے کے باغات ہیں، وہاں یہ سفید ہاتھی پایا جاتا ہے۔

ڈچ پادری کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سختی سے اندر کو بھنچ گئے۔ اس نے جلدی سے لٹکتی ہوئی صلیب کو پکڑ لیا۔ اور میری طرف نفرت سے دیکھ کے منہ پھیر لیا۔

سانولے رنگ کے پادری نے کہا، تمھیں فادر سے ایسے الفاظ کہنے کا کوئی حق نہیں تھا!!

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ میں نے فادر کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی ہے۔ میں تو ہاتھیوں کا ذکر کر رہا تھا۔

رستے میں ایک اسٹیشن آ رہا تھا۔ پادریوں کو ابھی آگے اترنا تھا مگر وہ دونوں یہیں اتر گئے۔ گاڑی سے اترتے ہوئے، سانولے رنگ کے پادری نے میری طرف زہر میں بجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ اسلئے میں نے کہا۔ اب جاتے ہو تو یہ بھی سنتے جاؤ۔ کہ سفید اور کالے ہاتھیوں میں ہمیشہ لڑائی رہا کرتی تھی، دونوں الگ الگ اپنے گلے بنا کے جنگل میں گھوما کرتے تھے۔ مگر اب سنا ہے کہ آجکل کالے اور سفید ہاتھی میں بڑی ملی بھگت ہو رہی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں سونڈ ڈالے ایشیا کے جنگلوں

میں گھوم رہے ہیں۔

ڈچ پادری اور دیسی پادری، سورٹ کیس اٹھائے میری کھڑکی کے سامنے سے گذر گئے۔ میں نے بچوں کی طرح چلا کے کہا۔

"نزی ہیں دوس"

ترچپور جانے کے لیے گاڑی ارکنوم سے بدلنی پڑتی ہے۔ کوچین ایکسپریس یا مالابار ایکسپریس جو مدراس سے آتا ہے۔ اس میں بیٹھ کر شوانور تک جاتے ہیں۔ شوانور سے پھر ایک لائن مڑتی ہے۔ جو کوچین بندرگاہ کی طرف جاتی ہے ترچپور اسی رستے پہ ہے۔ اور یہاں سے کوچین کی بندرگاہ کا سفر ریل سے دو گھنٹے کا ہوگا۔ ایک رات اور سفر میں کٹی۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ صرف گوٹی کے مقام پہ یہ دیکھا کہ سٹیشن پر لڑکے بریانی کو سفید لفافوں میں بند کر کے بیچ رہے ہیں۔ میں نے بھی بریانی کا ایک لفافہ خریدا۔ اور اسے کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس بریانی میں روغنیت تو کم ہے۔ ہاں خشکی زیادہ ہے اور اگر کسی دوسرے سالن کے ساتھ ملا کے نہ کھایا جائے تو بعد میں حلق کو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا کسی نے پان میں زیادہ چونا لگا دیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ میں نے دوسرا کھانا بھی منگوا لیا تھا۔ ورنہ شاید میں بریانی کو پھینک دیتا

شوانور سے ترچپور جاتے ہوئے ساحلی علاقہ بہت قریب آجاتا ہے اس لئے ناریل کے بلند و بالا درخت جگہ جگہ گھاٹیوں، وادیوں اور کھیتوں دریاؤں اور ندی نالوں کے کنارے اپنے خوشنما پنکھ پھیلائے دکھائی دیتے ہیں نیلے پانیوں کے تالاب، دھان کے کھیتوں کی ہریالی اور صاف ستھرے

ملباری طرز کے مکان ناریل کے ریشوں سے چھپے ہوئے، بڑا سہانا منظر پیش کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر سے میرے ڈبے میں، دو مسلمان سوداگر آکر بیٹھ گئے جو، کوچین بندرگاہ میں کاروبار کرتے تھے۔ ان کے بعد ایک بڈھا لیکن بڑا ہی پھرتیلا اور وجیہہ مدراسی اندر داخل ہوا اس نے ایک بڑھیا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی تھی۔ اور دونوں ہاتھ کی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں

وہ دونوں مسلمان سوداگر، اور وہ بڈھا مدراسی ملیالم میں گفتگو کرنے لگے۔ قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کا حسب ونسب جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب وہ لوگ ایک دوسرے کا شجرہ ونسب پوچھ کر فارغ ہوئے تو میری طرف متوجہ ہوئے۔ ایک صاحب نے مجھ سے ملیالم میں کچھ کہا۔

میں نے انگریزی جواب دیا، میں یہ زبان نہیں جانتا۔

وہ آدمی چونکا۔ پھر مسکرا کے کہنے لگا۔ معاف کیجئے۔ میں آپ کو ایلپی کا باشندہ سمجھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ،، مجھے اس شہر کو دیکھنے کی حسرت ہے۔ ہاں؟

وہ بولا، میں ایلپی کا رہنے والا ہوں۔ ایلپی جو ہندوستان کا وینس ہے۔

بڈھا آدمی اپنی چھڑی اپنی سیٹ کے ساتھ لگائے بولا۔ میں بھی ایلپی کا رہنے والا ہوں ،،

نوجوان مسلم سوداگر سے میں نے پوچھا۔ آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟

وہ بولا میں ال ایل بی میں پڑھتا ہوں۔ اور ساتھ میں ان بڑے بھائی (دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) ان کے ساتھ بزنس کرتا ہوں۔

کیا بزنس؟

ہارڈ ویئر (HARDWARE) آپ کیا بزنس کرتے ہیں؟

میں نے کہا (SOFTWARE) سافٹ ویئر۔

وہ ہنسا، یہ سافٹ ویئر کیا ہوتا ہے؟

میں نے کہا، آپ لوہے کا بزنس کرتے ہیں نا ـــــ میں قلم کا بزنس کرتا ہوں۔

بڑے بھائی نے کہا۔ تو آپ فونٹن پین بیچتے ہوں گے!

میں نے کہا یہی سمجھ لیجئے۔

بڑا بھائی بولا۔ کچھ بھی ہو صاحب، اس بزنس میں وہ فائدہ نہیں رہا کمبخت مزدوروں کا دماغ ہی بگڑ گیا ہے۔

چھوٹا بولا۔ اپنی میں میرا ایک کارخانہ ہے۔ وہاں بھی یہی حال ہے پھر وہ میری طرف دیکھ کے کہنے لگا۔ سب یہ کمیونسٹوں کا کیا دھرا ہے۔ کیوں صاحب۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

مگر میرا بیٹا کہتا تھا۔ وہ بڈھا پھر کہنے لگا۔ میرا بیٹا کہتا تھا۔ ہم ان لوگوں کو ٹھیک کر دیں گے۔ اور میرا بیٹا آپ جانتے ہیں کون ہے؟

کانگریسی ہے؟ میں نے پوچھا۔

نہیں!

ہندو مہاسبھائی؟

نہیں، نہیں!

تو آر۔ ایس۔ ایس والا ہوگا۔

نہیں صاحب میرا بیٹا ملز کی یونین کا سکریٹری ہے۔ آپ کیا بات کرتے ہیں۔

اور میں نے کہا۔ معاف کیجئے گا صاحب۔ مگر آپ یہ غلط کہہ رہے ہیں۔ بھلا لڑکوں کو سیاست سے کیا کام!

بڈھا بولا۔ مگر کمیونسٹوں کو دبانے میں سیاست کیسی۔ یہ تو سیدھی سادی بات ہے۔ میرا کاروبار ان مزدوروں کی ہڑتال کی وجہ سے بند ہوا جا رہا ہے۔

بڑا بھائی بولا۔ میرے بزنس میں بھی یہ لوگ گڑبڑ مچا رہے تھے۔ میں نے سب کو نکال کر دوسرے مزدور رکھ لئے۔ اب سنا ہے پھر گڑبڑ ہونے والی ہے۔ میں نے کل مدراس میں تار دیا۔ میں آج ہی کوچین واپس جا رہا ہوں۔ یہ گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔

کیوں صاحب؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔

دیکھئے سوداگر بولا ۔ اب اس سرکار نے باہر ناریل بھیجنا بند کر دیا ولایت میں ناریل کا بھاؤ پانسو روپے ٹن سے اوپر ہے ۔ یہاں ڈھائی سو روپے ہے ۔ تو ہمیں ڈھائی سو روپے فی ٹن نقصان ہو رہا ہے

میں نے کہا یہاں ناریل ڈیڑھ سو روپے ٹن ہے ۔ اس حساب سے آپ کو ایک سو روپے فی ٹن زیادہ مل رہا ہے ۔

میں یہاں کی بات نہیں کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا ۔ اور ملایا میں پچھتر روپے فی ٹن ہے ۔ اور سنگاپور میں پچاس روپے فی ٹن ہے ۔ اور اگر آپ بانڈونگ چلے جائیں ۔ تو وہاں آپ کو اتنے ناریل مفت مل جائیں گے ۔ کہ آپ اس سے اپنا قبر روضہ تاج محل سے بھی بڑی بنا سکتے ہیں ۔ آیا خیال شریف میں !

بڑا بھائی چونکا ۔ اس نے چونک کر چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا چھوٹے بھائی نے بڈھے مدراسی کی طرف دیکھا ۔ بڈھے مدراسی نے میری طرف اس طرح دیکھا ۔ گویا مجھے وہ ذات سے باہر کر دیا ہو اور اگر ان کا بس چلتا تو مجھے ڈبے سے باہر کر دیتے ۔ مگر وہ تو خیریت ہوئی کہ تریچور کا سٹیشن جلد آگیا ۔ جہاں مجھے اترنا تھا ۔

آج تریچور کے چھوٹے سے سٹیشن پہ بہت بھیڑ تھی ۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب والنٹیئر سرخ بلے لگائے کھڑے تھے ۔ چند

لوگوں نے مجھے پہچان لیا۔ اور خوش آمدید کے نعرے لگائے
پھر فضا میں انقلاب زندہ باد کی آواز سنائی دینے لگی۔ اور
جب میں گاڑی سے اترا تو لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں صرف ایک بار
گھوم کر اپنے ہمسفر امیر ساتھیوں کی طرف دیکھ سکا۔ جو بڑی
حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر میں نے اتنا سنا
چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے کہہ رہا تھا "یہ بھی حد ہی ہے۔" اتنا
کہہ کے انہوں نے کھڑکی بند کر لی۔ اور ہماری طرف پیٹھ موڑ کر سو
گئے۔ لیکن انقلابی نعرے پانی کے طوفانی ریلوں کی طرح برابر گاڑی
کے ڈبے کے اندر سنائی دے رہے تھے۔

"انقلاب زندہ باد"

"انجمن ترقی پسند مصنفین زندہ باد"

"مزدوروں اور ادیبوں کا اتحاد زندہ باد"

ہارڈویئر کی بزنس کرنے والے ہماری طرف پیٹھ موڑ کے بیٹھ
گئے تھے اور کبھی کبھی کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھ لیتے۔ ان کی
چور نگاہوں کا سہما سہما انداز ان کے پریشان دلوں کی غمازی کر رہا
تھا۔ ہارڈویئر کی بزنس کرنے والے سافٹ ویئر والوں کے سامنے
مجرموں کی طرح خاموش اور ہراساں تھے۔ فضا میں ساتھیوں
کے نعرے تھے۔ اور میرے دل میں اقبال کا یہ مصرع ......

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"

دھیرے دھیرے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سٹیشن سے باہر نکلا، میں جنوبی ہند پہلی بار آیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہاں آکر مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی تو اجنبیت اور بیگانگی کا احساس نہیں ہوا۔ میرے چاروں طرف مسرت سے کھلے ہوئے چہرے تھے۔ اور میں انھیں اور وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے۔ گویا ہم لوگ ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ اوپری طرح سے نہیں۔ اجنبی مسافروں کی طرح نہیں۔ معمولی دوستوں کی طرح نہیں جانتے۔ بلکہ ایک ایسی گہری دلی رفاقت کے رشتے سے جانتے ہیں جیسے ہمیشہ سے میری زندگی ان کی ہے۔ اور ان کی زندگی میری ہو چکی ہے۔!

تریچور ایک چھوٹا سا بستی شہر ہے۔ آبادی ستر سے زیادہ نہ ہوگی عمارات میں کھلی اور قدامت پرستی کے آثار نمایاں ہیں۔ شہر کے وسط میں شیو جی کا مندر ہے۔ اور اس کے ارد گرد ایک پارک ہے۔ جہاں آجکل ایک غیر ملکی کمپنی آکے ٹھہری ہے جس کے اجلاس تھا

ناچ، گانا اور جوا ہوتا ہے۔ اور رات کے دو بجے تک گانوں کی
آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں پہلے ترسپوسا گوا ان کا ایک بہت بڑا جنگل تھا۔ پھر جب سال
کسی نے شیوجی کا مندر تعمیر کیا۔ پھر یہ شہر اس مندر کے ارد گرد آباد ہونا
شروع ہوا۔ اب بھی ہر سال شیوجی کا مندر پر میلہ لگتا ہے جہاں آس پاس کے
علاقے سے کئی لاکھ زائرین پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے مندر کے پجاریوں کو
ہزاروں روپے چڑھاوے کے ملتے ہیں۔ اور شہر کے تجارتی حلقے
بھی مالا مال ہو جاتے ہیں۔ یہاں تجارت زیادہ تر عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے
اور عیسائی لوگ زیادہ ہیں جو در اصل ریاست ٹراونکور اور کوچین
کا حاکم طبقہ سمجھنا چاہیئے۔

عیسائیت کی تاریخ ریاست ٹراونکور اور کوچین میں بہت پرانی ہے
یہاں یہ مذہب یورپی فاتحوں کے ہمراہ نہیں آیا۔ بلکہ اس سے بہت
پہلے عیسائی مبلغین یہاں آ کے مسیحیت کا پیغام پھیلانے لگے تھے۔
یہاں ایک گرجا ہے جو نو سو برس پرانا ہے۔ کہتے ہیں سب سے پرانا
عیسائی مبلغ جس نے جنوبی ہند میں قدم رکھا وہ خود حضرت مسیح کے چیلے سینٹ
طماس تھے۔ جن کا گرجا ابھی یہاں موجود ہے۔ پرانے زمانے میں یہاں
کے ساحلی علاقے سے جہاز فلسطین اور روم تک جاتے تھے۔ اور پرانی
بائبل میں شاہ سلیمان کے محل کا ذکر ہے۔ جو مشرق سے لائی گئی ساگوان
کی لکڑی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے متعلق قیاس غالب ہے کہ وہ ملبار

کے ساگوان کی لکڑی ہی تھی۔ نہ وہاں استعمال کی گئی تھی۔ اس سے کم از کم اتنا تو ضرور پتا چلتا ہے۔ کہ جنوبی ہند کا رشتہ مسیحی دنیا سے کوئی نیا نہیں، کئی سو برس پرانا ہے۔ اس بات کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے۔ کہ شمالی ہند میں بیشتر عیسائیوں کی طرزِ معاشرت آج بھی اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جنوبی ہند میں ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی زبان اور رہن سہن کے طریقے نہیں بدلے۔ ہاں تو یہ ہے کہ گرجاؤں کی تعمیر میں بھی ہندی اثر نمایاں ہے۔ جیسے جنوبی ہند کے مندر کے باہر ایک کوڈی مردم یعنی جھنڈا لہرانے والا اونچا کھمبا ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سے گرجاؤں کے باہر بھی اسی ڈھنگ کا کوڈی مردم پایا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت میں نے شمالی ہند کے گرجا میں نہیں دیکھی بلکہ اس کے علاوہ آپ کو شہروں اور گاؤں کے چھوٹے چھوٹے شوالوں کی طرح یہاں بھی آپ کو گلی کوچوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے گرجا ملیں گے۔ جن کے سر کے اوپر اگر صلیب نہ ہو تو آپ انھیں بالکل شوالے ہی سمجھیں گے۔

کوچین اور ٹراونکور کی آبادی میں عیسائیوں کا حصہ تیس فیصدی سے کم نہ ہوگا۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ٹراونکور اور کوچین اور ہندوستان بھر سے زیادہ ہے۔ یعنی کوئی پچاس فیصدی۔ نظامِ زندگی۔ چونکہ وہی پرانا ہے اس لئے پڑھنے لکھنے کے باوجود بدستور غریب ہیں۔ ہاں چرچ بہت امیر ہے۔ زور زیادہ تر کیتھولک فرقہ کا ہے۔ لیکن دوسرے چرچ بھی ہیں۔ جن میں دھڑے بندی اور مقدمے بازی تک بھی ہوتی

رہتی ہے جن میں جمہور کی دولت برباد ہوتی ہے۔ ہر سال نئے گرجا
تعمیر ہوتے ہیں یا پرانے گرجاؤں میں کوئی نہ کوئی اضافہ ہوتا رہتا ہے
اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک اچھے گرجا پر کم از کم پانچ لاکھ روپے
خرچ آتے ہیں۔ یہ روپیہ بھی جمہور کی جیب سے نکلتا ہے۔ عوام جو
دولت پیدا کرتے ہیں۔ اس کا آدھا کے قریب حصہ چرچ کی نذر ہوتا
ہے۔ کچھ حصہ جاگیردار اور پھر حکومت کی نذر ہو جاتا ہے۔ کچھ قرض
کی صورت میں ادا ہوتا ہے۔ جو باقی بچتا ہے وہ گزارے کے لئے
قطعی ناکافی ہوتا ہے۔ بعض علاقوں میں غریبی اس قدر ہے کہ دیکھی
نہیں جاتی۔ لیکن ان علاقوں کے گرجا بڑے شاندار ہیں۔ اور
پادری اور بشپ بھی بڑے ٹھاٹھ سے دکھائی دیتے ہیں۔

بورژوا طبقہ چاہے عیسائی ہو یا ہندو یا مسلمان، رہتا وہ بورژوا ہی
طبقہ میں ہے۔ اور اپنے طبقہ کے مادی مفادات کو ظاہر کرتا ہے
اس کی ایک مثال آپ کو تریچور میں ملے گی۔ چند سال ہوئے یہاں
شیوجی کے مندر میں پجاریوں کے دو گروہ ہو گئے، جھگڑا
مذہبی نہیں تھا۔ چڑھاوے کی تقسیم پر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پجاریوں میں
چل گئی۔ خوب سر پھٹول ہوئی۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ جب تک
چڑھاوے کا فیصلہ نہیں ہوتا سالانہ میلہ بھی بند رکھا جائے۔ یہ
ظاہر ہے کہ اس امر سے عیسائیت کے فلسفے کو کوئی نقصان
نہیں پہنچتا تھا لیکن عیسائی بورژوا طبقہ کی تجارت پر اثر پڑتا تھا

کیونکہ یہ لوگ مندروں کے مشہور میلے کے دنوں میں لاکھوں روپے
کما لیتے تھے۔ اس لئے اس طبقہ کے بااثر لوگ مندر کے پجاریوں سے
ملے۔ ان کا سمجھوتہ کرایا۔ اس کے علاوہ مندر کو بیس ہزار روپے
چڑھاوا دیا۔ اور پجاریوں کو مجبور کیا کہ وہ امسال بھی سالانہ میلہ
کریں۔ اور سلسلے میں اور جو مزید اخراجات ہوں گے وہ بھی لوگ
برداشت کریں گے۔ چنانچہ میلہ ہوا اور زائرین نے لاکھوں کی
تعداد میں شیو جی مہاراج کے درشن کئے۔ اور اسمیں برائی کیا ہے
جب مذہب کے سہارے عوام کو لوٹا جا سکتا ہے تو گولی چلانے کی
کیا ضرورت ہے۔ گولی تو اس وقت چلائی جاتی ہے جب اپنے
منافع خطرے میں ہوں گے اور کوئی ذریعہ سمجھ میں نہ آتا ہو۔

اس تحریک میں ملیالی زبان کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس گذشتہ
دسمبر سے شروع ہو رہی تھی۔ ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں کو ایک
دوسرے میں ضم کر دینے کے بعد بھی کیرالا کے علاقے کا ایک حصہ
مدراس میں رہ گیا تھا۔ لیکن جب قوم اور زبان ایک ہو تو اس قسم
کی غیر جغرافیائی حد بندی زیادہ دیر تک قومی تحریک کے سامنے نہیں
ٹھہر سکتی۔ ایک بار کیرالا کی آواز، کیرالا کے گوشے گوشے سے اٹھ
رہی ہے۔ اور یہ آواز محنت کش مزدوروں اور کسانوں کی تحریک
کی آواز ہے۔ اس لئے یقین ہوتا ہے کہ جمہوری کیرالا بن کے
رہے گا۔ اور ملیبار کا وہ علاقہ بھی اس میں آ جائے گا جو ابھی تک

صوبہ مدراس میں ہے اور جہاں آج بھی انگریزوں کے زمانے کی سپیشل پولیس تعینات ہے۔ اور جہاں آج بھی کیرالا کے بہادر سپوت۔ ان تمام آلائم اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنے گھروں اپنی زمینوں، اور اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کر رہے ہیں۔

اس کانفرنس میں شمالی مالابار کے بہادر کسان ادیب اور مزدور ادیب بھی شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ٹراونکور کوچین اور شمالی مالابار کے گوشے گوشے سے یہ ادیب آئے تھے۔ طالب علم، جرنلسٹ، مزدور اور کسان جو اپنے اپنے محاذ پر لڑتے ہوئے بھی ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور اسے اپنے ملک کے سیاسی حالات اور سماجی، اور سماجی تحریکوں کا اہم حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ جو ادب کی تخلیق شوقیہ نہیں کرتے تھے جیسے بیٹھ بازی شوقیہ کی جاتی ہے۔ بلکہ اسے زندگی کی ایک اہم ضرورت سمجھ کے اور زندگی کی لڑائی میں اس کی ضرورت اور اس کی افادیت کا احساس اپنے دل میں رکھتے ہوئے اپنے خون جگر سے اسے سینچتے تھے۔

MANSOOR BROTHERS
No.........................
LIBRARY
Delhi Colony, KARACHI.

کانفرنس کا افتتاح شہر [illegible] ہوا۔ پہلے روز مندوبین کی تعداد چھ سو کے قریب تھی۔ سب سے پہلے ہمارے کل

ہند ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی طرف سے ایک پیغام پڑھ کے سنایا۔ اس کے بعد اچیوتن کردپ نے ملیالم زبان میں اپنی صدارتی تقریر میں مقامی حالات کا جائزہ لیا۔ اس سے چند ماہ پہلے کیرلا کے ادیبوں کی ایک کانفرنس ہو چکی تھی۔ جس میں ترقی پسندوں کے نئے منشور سے بحث کی گئی تھی۔ لیکن یہ بحث کسی خاطر خواہ نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ منشور کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اور اس کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے جو کمیٹی بنی تھی۔ اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ اور معاملے کو یوں ڈھیل دی کہ پورے کیرلا میں انجمن کا کام تقریباً ختم ہو گیا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ کانفرنس بلائی گئی تھی۔ تاکہ انجمن کی تحریک کو پھر سے استوار کیا جا سکے اور اس کا رشتہ عوامی تحریک سے مضبوط کیا جا سکے۔ خیال تھا کہ اس سلسلے میں بہت سی مشکلیں پیش آئیں گی اور رجعت پسندوں سے جو بدستور انجمن کو ایک عضوِ معطل بنائے رکھنا چاہتے تھے، زبردست مقابلہ بھی ہوگا۔

مندوبین میں ایسے عناصر بھی تھے۔ جو انجمن کے نئے منشور اور اس کی دلیرانہ روش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ ایسے کرم فرما بھی تھے جو اپنے گندے انڈے کے خول میں رہ کر ادب برائے ادب کی تخلیق کرنا چاہتے تھے۔ جس کا مظاہرہ وہ عملاً یوں کرتے تھے۔ کہ گندی جنسی کہانیاں لکھتے تھے۔ اور اس قسم کی شاعری کرتے تھے۔ جسے پڑھتے وقت آدمی کو غسل خانہ کا خیال آتا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب

وہ تھے جنہوں نے ایک گرم کتیا اور اس کے مالک کے غیر فطری عشق
کی کہانی لکھی تھی۔ اور اسے ترقی پسندی کی سند سمجھتے تھے۔ اور یہ
لغو حرکتیں اس وقت ہو رہی تھیں۔ جب کسان بھوک سے مر رہے
تھے۔ اور اپنا غلہ۔ اپنی محنت سے پیدا کیا ہوا غلہ اپنے گھر میں رکھنے
کے لئے جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں سے لڑ
رہے تھے۔ اور ان کی حکومت کے استحصالی ہتھکنڈوں کا مقابلہ
اپنی متحدہ قوت سے کر رہے تھے۔ ایک طرف شہیدوں کا خون
تھا۔ دوسری طرف کتے کتیا والی شاعری تھی۔ اور ادیبوں کو اپنا
موضوع سخن چننا تھا۔ یہ کانفرنس اسی مقصد کے لئے بلائی گئی تھی
رفیق اچھوت کردیپ نے کئی گھنٹے تقریر کی۔ وہ تلنگانہ
کی حمایت میں بولا اور بڑی جی داری سے بولا۔ کردیپ کا قد میانہ
ہے۔ دبلا، پتلا، سانولا، گھنی بھووں کے نیچے چھوٹی چھوٹی آنکھیں
ذہانت اور مزاح سے چمکتی ہوئی یہی مزاح اور طنز اس کی تقریر
میں بھی چمکتا ہے۔ یہ تقریر کرتے ہوئے سننے والوں کو مرعوب
کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ انہیں ہنساتے ہوئے اپنے ساتھ
لے جاتا ہے۔ اس کا تجزیہ مارکسی لیکن طنز سے بھرپور ہوتا ہے اور
وہ اسی انداز میں کئی گھنٹے تقریر کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے
پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ اور ہندو دیو مالا کے بہت سے پرانے
قصے اسے یاد ہیں۔ جن کا اطلاق وہ توڑ موڑ کر موجودہ حالات پر کرتا

رہتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں عذری سند کے عوام کے لئے جو اپنی دھرتی والا سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں اور ایک کیل کی طرح ان کے ذہن میں گڑ جاتی ہیں۔

MANSOOR BROTHERS
No. ....
LIBRARY
...hi Colony KARACHI.

اس کی ایک دو مثالیں مجھے یاد آگئی ہیں۔ ایک ... کے دوران میں ترقی پسند ادب کے مختلف رجحانات سے بحث کرتے ہوئے گروپ نے کہا کہ ہم لوگ اپنے ادب میں نظریاتی سچائی اور اور فکری رجحان اور اسی کی صحت پر تو بڑا زور دیتے ہیں اور دیتے رہے ہیں لیکن اس عرصہ میں ہم اپنے اصلی دشمن یعنی استحصال کرنے والے طبقہ کو جو برسر اقتدار ہے بالکل بھول جاتے ہیں اور ایسا ادب تخلیق نہیں کرتے جو اسے بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو اس کی وضاحت کرتے ہوئے گروپ نے ایک عیسائی واقعہ بیان کیا۔ جیسے کہ ایک کسان کی گائے مل گئی۔ اور جیسے وہ اپنے گھر لیجانا چاہتا تھا۔ گائے کے گلے میں ایک لمبا رسہ تھا جسے کوپلے تو اسے گناہ کا خیال آیا۔ تو وہ گھوم کر اس گائے کو اسی لمبے رسہ سے کھینچتا ہوا پادری کے پاس لے گیا۔ پادری بے چارہ بڑا متقی پرہیزگار تھا۔ اس نے عیسائی کو صلاح دی کہ وہ سڑک پر جا کر

جہاں اسے گائے ملی تھی زور زور سے آواز دے کر گائے کے مالک کو سات بار بلائے اور پھر بھی مالک دستیاب نہ ہو تو وہ پھر اس گائے کو اپنے گھر لے جا سکتا ہے۔

چنانچہ اس عیسائی نے ایسا ہی کیا۔ وہ سڑک پہ جا کر زور زور سے چلانے لگا۔ "ایک لمبا رسہ ہے" "ایک لمبا رسہ ہے۔" اس کے بعد نہایت آہستہ سے کہتا "جس کے سرے پہ ایک گائے بندھی ہے" اس طرح سات بار آوازیں دینے کے بعد وہ عیسائی گائے اپنے گھر لے گیا۔

کروپ نے کہا۔ ترقی پسندوں کا لمبا رسہ وہ فکری اور نظریاتی رجحان ہے جس پہ ہم لوگ زور دیتے ہیں اور اس کے متعلق اپنی تحریروں میں زور زور سے چلاتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک گائے کا تعلق ہے۔ یعنی انقلاب، دشمنوں کی مخالفت اور بیخ کنی کا تعلق ہے وہاں ہماری آواز دب جاتی ہے۔

MANSOOR BROTHERS
No..............
LIBRARY
Delhi C... DELHI

اس طرح حکمت عملی کا ذکر کرتے ہوئے کروپ نے ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا جو کہتے ہیں کہ ہیئت کا حسن ہی سب کچھ ہے

اور نفسِ مضمون کچھ نہیں۔ ہیئت پرستوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کروپ سنبادی ڈیڈالا کے قدیم فن کار تیروالدتن کا ذکر کیا جس نے ایک دفعہ بھنگ میں ترنگ میں ایک بڑا جھاڑو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا ایک سرا گوبر میں ڈبو کر اسے دیوار پر دے مارا۔ اور جب لوگوں نے دیوار پر گوبر کا یہ نشان دیکھا تو انہوں نے تیروالدتن سے پوچھا یہ کیا ہے۔

فن کار نے کہا۔ "یہ گھوڑے کی دم ہے"

لوگوں نے پوچھا "اور گھوڑا کہاں ہے؟"

تیروالدتن نے جواب دیا۔ "گھوڑا دیوار کی دوسری طرف ہے۔"

ہیئت پرستی کے شعری اور نثری کارنامے بھی تیروالدتن کے اس شاہکار کی طرح ہیں جو اس نے گوبر سے تخلیق کیا تھا؟

کروپ نے طیبالم لبان کے رجعت پسندوں پر اپنی طنز کے تیر برسائے۔ اس کے ساتھ اس نے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے نئے مینی فسٹو کی اہمیت بتائی۔

رفیق اندر چوڑن نے بھی نئے منشور کے متعلق نکات سے بڑی مدلل بحث کی۔ اندر چوڑن اور کروپ کا خیال یہ تھا کہ رجعت پسند عناصر کی طرف سے نئے منشور کی سخت مخالفت ہوگی۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں سارا زور دائیں طرف سے آنے والے اعتراضات کا جواب دینے میں لگا دیا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ اعتراضات دائیں طرف

سے نہیں بائیں طرف سے آئے۔ کچھ رجعت پسندوں نے تو کمیل اپنے ہاتھ سے جاتا دیکھ کر (   ) بن کے اعتراضات وارد کئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعد میں جو بحث ہوئی۔ اور جس میں کسان اور مزدور راہیوں نے اور طبقاتی مورچے پر لڑنے والے نوجوانوں نے بھرپور حصہ لیا۔ وہ لوگ واقعی نئے منشور میں انقلابی جوش کی گرمی اور اس کی دھمک کو کم محسوس کرتے تھے۔ نئے منشور پر جو بحث ہوئی اس میں کم و بیش پچیس سے زیادہ مندوبین نے حصہ لیا۔ اور اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ نئے منشور میں کیرلا کے شہیدوں اور طلباء کے جنگجو لڑکوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ لوگ اس سے زیادہ تیز اور گرم قسم کا منشور چاہتے تھے۔ رفیق اندوچومن نے اپنی جوابی تقریر میں نئے منشور کی حمایت کرتے ہوئے بڑی زوردار تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس نئے منشور کو منظور کر لینا چاہیئے۔ یہ منشور ہماری نئی لڑائی کا آغاز ہے۔ اختتام نہیں۔ ہمیں اس موقع پر ترامیم پیش کر کے اپنے آپ کو کل ہند جمہوری محاذ سے الگ نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کا ساتھ دے کر اپنی لڑائی کو اس قدر مضبوط بنانا چاہیئے تاکہ ہم اس نئے منشور سے بہت زیادہ آگے جا سکیں اور اپنے ساتھیوں کو اس کے لئے آمادہ کر سکیں۔

دو دن کی مسلسل بحث و تمحیص کے بعد انجمن کا نیا منشور باتفاق رائے پاس کیا گیا۔ دیگر مندوبین کی تقریروں سے بھی کانفرنس کی جنگجویانہ

اسپرٹ کا اندازہ ہوتا تھا ۔

فری دھر ایک طالب علم ادیب نے اپنی تقریر میں کہا، وہی انقلابی ادیب اچھا ادب پیدا کر سکتا ہے ۔ جو عوامی تحریکوں میں حصہ لے کے دوش بدوش لڑے ۔

اشوک ایک کھیت مزدور ہے اور شاعر ہے ۔ وہ ہریجن ہے اور پالیا ذات کا ہے جو ہندو سماج میں سب سے نچلے درجہ پر سمجھی جاتی ہے ۔ اشوک نے اپنی تقریر میں ادب کی طبقاتی اہمیت پر زور دیا ۔ اور بتایا کہ ادب طبقوں سے باہر نہیں ہے ۔ وہ کسی نہ کسی طبقے کی طرفداری ضرور کرتا ہے ۔ چاہے صاف طور پر کرے، چاہے چوری چوری چھپے ۔ ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ صاف طور پر دیانت داری سے مزدور اور کسان کے طبقے کے لئے لکھے، اور ان کی لڑائیوں میں حصہ لے ۔

ایک اور ملباری مزدور ادیب نے اٹھ کے
پوچھا: آپ لوگ محنت کشوں کے لئے لکھتے ہیں۔ پھر آپ ہمارا
جھنڈا کیوں استعمال نہیں کرتے؟
اسی طرح کے نارائن نے جو شمالی ملبار سے آیا تھا ایک
رجعت پسند کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا تم کہتے ہو
کہ عوام کو ادیبوں کے ادب کو پرکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ
تم کس منہ سے کہتے ہو۔ تم تو صرف لکھتے ہو۔ ہم اپنا خون بھی
دیتے ہیں۔

اندرچوڑن نے کہا۔ یہ منشور ادیبوں اور فن کاروں کو کانگرسی
سرکار کے خلاف احتجاج پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ کانگریس حکومت
اب سماجی ترقی کی سب سے بڑی دشمن بن چکی ہے صوبہ مدراس
کے ایک وزیر کے مادھومینن نے کچھ عرصہ ہوا کہا تھا کہ اشتراکیوں
کو پرانے ادب کی عظمت کا کوئی پاس نہیں ہے۔ اور وہ جمہور
کے ادب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ میں اس بہتان کے
جواب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اشتراکی نہیں بلکہ کانگریسی
سرکار ہے۔ جو کلچر دشمنی اور دشمنی پہ اتر آئی ہے۔ مدراس کی پولیس

شمالی ملبار کے علاقے میں کتنے ہی کتب خانوں کو جلا دیا گیا۔ ان کتب خانوں میں سینکڑوں کتابیں تھیں۔ رامائن سے لے کر موجودہ ترقی پسند ادب تک یہ سب کتابیں جلا دی گئیں جس طرح کبھی نازیوں کے برلن میں جمہوریت پسند ادیبوں کی کتابیں جلا دی گئیں تھیں۔ آج کون کلچر کا دشمن ہے۔ ہم یا وہ جو لائبریریاں جلاتے ہیں۔ جو ہمارے ڈراموں اور کھیلوں پر پابندی عاید کرتے ہیں۔ جو ترقی پسند رسالوں کی ضبطی کا حکم دیتے ہیں۔ اور کتابوں اور رسالوں کو بھی ضبط کر لیتے ہیں۔ جنہیں کبھی انگریزوں کی حکومت نے بھی ضبط نہیں کیا تھا۔ آج کیرلا کے درجنوں ترقی پسند ادیب جیل کی کوٹھریوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ کیا یہ سب کلچر کی محبت میں ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جب تک ہندوستان کانگریس کی اس نئی غلامی سے آزاد نہیں ہوتا۔ اس کا کلچر بھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

مینی فسٹو کے منظور ہونے کے بعد ہی فوراً ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ مسٹر وی۔ وی کے ولاتھ جو ملیالم زبان کے ادیب ہیں اور اس سے پہلے عریاں جنسی کہانیاں لکھنے کا شوق کرتے تھے۔ انھوں نے پلیٹ فارم پر آ کے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ اور وعدہ کہ آئندہ سے اپنی سماجی روش کو یک قلم بدل دیں گے۔ اور نئے منشور کے منظور کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے۔

ان کے بعد کے اسے احمد تشریف لائے یہ گندمی رنگ کے خوش شکل نوجوان تھے۔ نیلے رنگ کی بڑھیا قمیض پہن رکھی تھی۔ جسمیں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ ورنہ لباس نہی ملیالی تھا۔ یعنی دھوتی اور قمیض، مگر کپڑا بڑھیا، اور قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے سٹیج پر آکے ایک مختصر سی تقریر کی۔ ملیالم زبان ہیں، دو منٹ میں ہال تالیوں سے گونج گیا۔ معلوم ہوا آپ نے کانفرنس کی کارروائی سے متاثر ہو کر انجمن کو ایک ہزار روپیہ عطیہ دیا ہے۔ اندوچوڑن نے بڑی مسرت سے مجھ سے کہا۔ کمیٹی میں تو پریشان تھا۔ کیونکہ ہم لوگ گھاٹے میں جا رہے تھے۔ سوچ رہا تھا یہ اتنے سارے بل کیسے ادا ہوں گے۔ مگر اس رقم نے ہماری مشکل حل کر دی۔

MANSOOR BROTHERS.
No.....................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

جن دو دنوں میں ملیٹی فسٹول پر بڑے زور کی بحث ہوئی ان کے بیچ والی رات میں اسی ٹاؤن ہال میں ایک کلچرل پروگرام رکھا گیا یہ پروگرام تریچور کے عوام کو خاص طور پر بہت پسند آیا۔

سب سے پہلے پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا کہ ہندوستان کا نقشہ

سرخ ہے۔ اور ایک لڑکی ہاتھ میں سرخ جھنڈا لیے ہوئے جناگن منا کی طرز پر ایک گیت گا رہی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ گیت بھی الپی کے ایک مزدور شاعر نے لکھا ہے۔ جو نالہ یل کے لیے شیشہ بننے کا کام کرتا ہے۔

الپی کے صنعتی شہر سے مزدوروں کا ایک کلچرل جتھا آیا۔ ان کے ناچ اور گانے بے حد اچھے تھے۔ دو لڑکیوں کا رقص بہار ان بہت خوب تھا۔ ملیالم زبان کے مشہور ڈرامہ نگار پریم جی کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ بھی دکھایا گیا جو ایک امیر کسان کی زندگی کے متعلق تھا۔ اس میں امیر کسان کے غلام مزارع کا کردار خود پریم جی نے ادا کیا۔ میں نے آج تک اس کردار کو اس خوبصورتی سے ادا کرتے ہوئے کسی دوسرے ایکٹر کو نہیں دیکھا۔ میں ملیالم زبان نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن پریم جی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ، اس کے بازوؤں کے اشارے اس کی کردار نگاری کا مکمل سمجھا دیتا تھا کہ ڈرامے کی لطیف سے لطیف رمز سے محفوظ ہو رہا تھا۔ مسلم مزارع کا پارٹ بھی تھری پی کنجو نی نے بڑی بے باکی و بے ساختگی سے ادا کیا۔ ان دونوں فن کاروں نے اس ڈرامے کو ایسی دلکشی اور دل آویزی سے پیش کیا کہ اس ڈرامے کا ہر ایک منظر حاضرین کے دلوں میں اثر کر گیا۔ ڈرامے کے شروع میں امیر کسان کے مقابلے میں غریب مزارعوں کی بے کسی دکھائی گئی ہے ایسی حالت میں جس میں خود اپنی زنجیروں سے محبت کرتے ہیں

آخر میں غریب مزارعے کے امیر کسان کے خلاف بغاوت
کا علم بلند کرتے ہیں۔ اور مزارعے اور کھیت مزدور متحد ہو
کے امیر کسان سے اپنی زمین چھین لیتے ہیں۔ اور اس میں ہل چلاتے
ہیں۔ میرے خیال میں یہ ڈرامہ ملیالم زبان کے بہت اچھے ڈراموں
میں سے ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ترجمہ ہندوستان کی دوسری
زبانوں میں بھی ہونا چاہیئے۔ ہر صوبے کے عوامی تھیٹر کے لئے یہ بڑی
عمدہ چیز رہے گی۔ اس ڈرامے کے علاوہ (OPRATION ASYLE)
تمثیلچہ پیش کیا گیا۔ جو سارے کا سارا پرچھائیوں میں تھا۔ اس میں ۱۵
اگست ۱۹۴۷ء کی نام نہاد آزادی کا اچھی طرح سے پول کھولا گیا تھا
کانگریس اور لیگ کی ملی بھگت کا پول اچھی طرح کھولا گیا تھا۔ اس
تمثیلچے کی ریہرسیل اچھی طرح سے نہیں ہو سکی۔ کیونکہ وقت بہت
کم تھا۔ اس لیے اس میں تسلسل اور اکثر مقام پر تاثر کے فقدان کا احساس
ضرور ہوتا تھا۔ مگر بحیثیت مجموعی یہ ڈرامہ مزدور کسان تحریک کی
جمہوری لڑائی اور اس کی قوت کا اچھی طرح سے مظاہرہ کرتا تھا۔

لیکن جس چیز نے سارے ہال میں بجلی کی سی دوڑا دی۔ وہ ایک
چھوٹا سا دو منٹ کا منظر تھا۔ جس میں وایمور کے شہید پھر آگئے
ہیں۔ وہ چار سو مزدور شہید جنہوں نے کیرالا کی آزادی کے لئے سر سی
پی سے ٹکر لی تھی۔ اور جنہیں موجودہ دور سے قبل کانگریسی بھی بڑے
فخر سے اپنے شہید کہتے تھے۔ جب یہ شہید ہڈیوں کے ڈھانچے

رات کے سناٹے میں اپنی قبروں سے اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے سٹیج کے ایک کونے سے اٹھ کر دوسرے کونے کی طرف جاتے ہیں۔ اور پھر دشمن کی گولی کھا کر اپنی قبروں میں جا گرتے ہیں۔ تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ مجمع کے جوش و خروش کی کیا حالت تھی۔ چند منٹ تک ہر شخص ہال میں مٹھیاں بھینچے کھڑا وائیلور کے شہیدوں کے نعرے لگا رہا تھا۔ غصے کی شدت اور آواز کی گھن گرج کا یہ عالم تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی اس ٹاؤن ہال کی چھت بھک سے اڑ جائے گی۔ اور ان نعروں کی فلک شگاف گونج سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی۔

وائیلور کے جن لڑاکے جنگجو اور جانباز مزدوروں اور کسانوں کی قربانیوں کے بل بوتے پر کانگریس نے ٹراونکور اور کوچین میں حکومت کی۔ آج انھیں وائیلور کے شہیدوں کو کیرلا کے کانگریسی بالکل بھول چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنے اخباروں میں، اور اپنی تحریروں میں کھلے بندوں ان شہیدوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کئی لوگ کہتے ہیں۔ کہ ان شہیدوں کا خون یونہی غلطی سے بہایا گیا۔ ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آج کانگریسی رہنما اپنی طاقت اور حکومت کے نشے میں اندھے ہو کر یہ بھی بھول چکے ہیں کہ انھیں کامیابی کی منزل تک لے جانے میں وائیلور کے شہیدوں کا کتنا حصہ ہے۔ کئی کانگریسی وزیر اور رہنما اب بھی اپنے دل سے وائیلور کے

شہیدوں کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر ان نظر بندوں کو رہا نہیں کرتے
جو وائیلور کی لڑائی کے دوران میں۔ سر سی۔ پی کے وقت گرفتار
ہوئے تھے۔ دیکھا سر سی۔ پی جو کبھی کانگریس کے جانی دشمن تھے۔ اور
آج دلی میں قومی و لیڈروں کی دعوتوں میں بلائے جاتے ہیں۔ منہدا مریکی
کانفرنس میں سرکاری مندوب کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں
اور مدراس ریڈیو کلچر کے متعلق تقریر نشر کرتے ہیں۔ اس کلچر سے ابھی
تک شہیدوں کے لہو کی بو آتی ہے۔ ابھی تک وہ ہڈیاں وائیلور کی
خاک پاک پر بکھری پڑی ہیں۔ جہاں۔ سر سی۔ پی کے سپاہیوں نے
وائیلور کے بہادر مزدوروں اور کسانوں پر گولیاں چلائی
تھیں۔ ابھی تک ناریل کے درختوں کے سینوں میں ڈم ڈم کارتوسوں
کے وہ نشان موجود ہیں، جنہوں کے درختوں کے تنوں میں وس پانچ
گہرے اور چوڑے گھاؤ پیدا کر دیئے ہیں۔ انسانی سینوں کا کیا
حال ہوگا۔ اس کی کہانی شہید جانتے ہیں۔ کا المیہ دیکھ کر ہی
سمجھ میں آسکتی ہے۔

MANSOOR BROTHERS.
No.....................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

اس پروگرام کے دوسرے دن شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ پولس
ہمارے پبلک جلسے کو خلاف قانون قرار دے گی اور اگر پھر بھی

ہم نے جلسہ کیا تو گولی چلے گی۔ لیکن انجمن کے کارکنوں نے اس قسم کی پھیلائی ہوئی دھمکیوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اور بدستور پبلک جلسہ کے متعلق اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔

پبلک جلسہ شام کو تھا۔ جہاں مجھے بولنا تھا۔ لیکن دن کو مندوبین کے منظور ہو جانے کے بعد بہت سی تجویزیں باقی تھیں۔ جن پر مندوبین کی رائے درکار تھی۔

سب سے پہلے صدر کیجا نب سے تین تجویزیں پیش کی گئیں جو اتفاق رائے پاس ہوئیں۔ (۱) کامریڈ سٹالن کی سترھویں سالگرہ پر پیغام تہنیت (۲) کیرالا کے شہیدوں کو سلام (۳) نئے چین کو مبارکباد۔

تی فلیس نے اشتراکی امن کے متعلق تجویز پیش کی۔

مزدوروں کی مانگوں کے متعلق جو تجویز پاس ہوئی۔ اس کے محرک تیرتی گوپال تھے جو خود ایک مزدور ادیب ہیں۔ شہری آزادی کے متعلق جو کچھ تجویز منظور کی گئی۔ اسے کے جی پدمن بھان نے پیش کیا تھا۔ ان کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔

آپ ایک روز پلورکے مقام پر ایک کلچرل پروگرام میں حصہ لے رہے تھے۔ کہ پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ اور

تھانے لے جا کے کہا۔ اچھا سپاہیو۔ اب گاؤ ذرا اپنے سلور کے ہتھیاروں کا گیت۔

پدمن بھان نے پہلے تو انکار سے توقف کیا۔ پھر جب پولیس نے اصرار کیا۔ تو آپ ہتھیاروں کی شان میں ایک عمدہ سا انقلابی گیت گانے لگے۔

ابھی آپ نے پہلا ہی بند گایا تھا کہ پولیس والوں نے اور آپ کو روک کے خوب پیٹا۔ اور کہا اب گاؤ گے۔ آگے۔

پھر پدمن بھان نے دوسرا بند گایا۔ تیسرا بند گایا۔ چوتھا بند گایا، اور وہ گاتے ہی چلے گئے، اور ہر بند کے بعد پولیس والے روک کے انہیں، زور سے پیٹتے۔ گیت بہت لمبا تھا۔ لیکن پدمن بھان نے بھی طے کر لیا تھا۔ کہ وہ اسے ختم کر کے ہی رہیں گے۔ چنانچہ جب وہ آخری بند پر پہونچے تو پولیس والے انہیں اتنا پیٹ چکے کہ پدمن بھان لہولہان ہو کے بے ہوش ہو گئے۔

اس وقت تریچور کے ٹاؤن ہال میں یہ شخص کیرلا کے شخصی آزادی کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔ اس موضوع پر بولنے کا حق اس نے اپنا لہو دیکر حاصل کیا تھا۔ میرے دل میں مرلی دھر کا وہ جملہ کھٹکنے لگا۔ تم تو صرف لکھتے ہو ہم اپنا خون بھی دیتے ہیں۔ ہم اپنا خون بھی دیتے ہیں........

متحدہ کیرلا کا رزولیوشن پی۔ کے۔ لا منبر نے پیش کیا۔

تلنگانہ کے عوامی بہادر رہنماؤں کو سزا دی جا چکی ہے۔ اس کے متعلق صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ایک مزدور نے اپنا رزولیوشن پیش کیا۔ یہ مزدور ابھی شمالی ملبار سے آیا تھا۔ میں اس کا نام نہیں جانتا ہوں۔ کیونکہ وہ تازہ تازہ لڑائی کے مورچے سے آیا تھا۔ اس کے جسم پر ابھی تک پولیس کے لگائے ہوئے زخموں کے نشان تھے۔ اور وہ ابھی تک خون تھوکتا تھا۔ اور دیکھنے والوں کا خیال تھا۔ اور خود اس کا بھی یہی اندازہ تھا۔ کہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ خود شہید ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت اس وقت اس ہڈیوں کے پنجر میں جانے یہ کہاں کی آواز کہاں سے آگئی تھی۔ وہ گرجتے ہوئے فقروں میں اپنی زندگی کے آخری سانس گھول کر تلنگانہ کے بہادروں کو کانفرنس کا سلام بھیج رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بیس پچیس تیس برس میں مر جانا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ خنک انگلیوں کی اور رحمت بھری نگاہوں کی حاجت ہے مگر وہ تو وطن کا سپاہی تھا۔ جو نئے سماج کی بہتری کے لئے اپنی زندگی کا آخری لمحہ بھی نچوڑ لیتا ہے۔ اور اسے انقلاب کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ تلنگانہ کے لئے کانفرنس کو اس سے بہتر پیغامبر نہیں مل سکتا تھا۔ وہ پیغامبر جو خود گھستا ہے۔ اور خون بھی

MANSOOR BROTHERS
No.................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

دیتا ہے۔

ایک ایک کر کے سارے رزولیوشن ختم ہو گئے۔ کیرلا کے قومی اندیویل کی پرشتا نادار کانفرنس بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ کل ڈیلیگیٹ حضرات اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ اور کیرلا کے گاؤں اور شہروں میں نئے ادب کا چرچا کریں گے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں اندوچوڑن کی آواز آئی۔ دیکھو ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پولیس نے اس جگہ پر گھیرا ڈال لیا ہے۔ جہاں پر ہمارا پبلک جلسہ ہونے والا ہے۔

ایک لمحے کے لئے سارے ہال میں سناٹا چھا گیا۔

گورے رنگ کے بانکے ترچھے اندوچوڑن کے ذہین کتابی چہرے پر لڑائی کی چمک دوڑ گئی۔ اس نے ہنس کے منڈویئن سے پوچھا!

اب کیا ارادہ ہے؟

ہال میں سے ایک ہزار آوازیں آئیں ۔ جلسہ ہو گا۔

اندوچوڑن نے گرج کے کہا۔ ہاں ہاں جلسہ ہو گا۔ ضرور ہو گا۔ مگر کیسے ہو گا۔ جلدی میں گھبراہٹ میں اور پریشانی میں نہیں ہو گا۔ بڑے اطمینان میں بڑے مزے سے اسی وقار اور دبدبے

سے یہ جلسہ ہو گا۔ جس طرح سے ہماری یہ دو دن کی کانفرنس ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہمیں یہ یاد ہے کہ ہمیں اپنے معزز مہمان اور ساتھی کو بچانا ہے۔

اب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اندر چودھران نے کہا۔ آپ اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ مجھے والنٹیر چاہئیں جو اپنے سینے پہ گولی کھا سکیں۔ خود گولی کھا کے مر جائیں لیکن کرشن چندر کو بچا لیں۔

ہال میں ایک ہزار آوازیں گونج گئیں۔ پہلے ہم مریں گے پھر کوئی کرشن چندر کو ہاتھ لگائے گا۔ ہال میں ایک ہزار آدمی کھڑے تھے۔ ایک ہزار والنٹیر جو ایک آدمی کی جان بچانے کے لئے ایک ہزار جانیں گنوا دینے کے لئے تیار ہیں۔ اس ہال میں سے ایک ہزار آدمیوں میں سے کسی کے پیٹ میں درد نہیں اٹھا۔ کسی کو ضروری کام یاد نہیں آیا۔ کسی نے چپکے سے نکل جانے کا خیال بھی ظاہر نہیں کیا سب اپنی سیٹوں پہ کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔

اندر چودھران کے مسکرانے نے چند منٹ ہنسی سے کھل اٹھنے والی لڑائی نے اسے کس قدر پر امید اور چمکیلا بنا دیا تھا وہ آستینیں چڑھا کے کہنے لگے۔ ایسے نہیں دوستو! ایسے نہیں۔ سب لوگ بیٹھ جاؤ میں بتاتا ہوں۔

سب لوگ اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

اندو چودرن نے کہا میں چاہتا ہوں کہ جب آپ اس ہال سے باہر نکلیں تو شور مچاتے ہوئے ایک بے ہنگم جلوس کی صورت میں پبلک پارک کی سمت نہ جائیں بلکہ دس دس پندرہ پندرہ افراد کی ٹولیوں میں ایک دوسرے سے الگ الگ جا کے پبلک جلسے میں جائیں۔ اور اسٹیج کے ارد گرد چاروں طرف اپنے دستے جما کے بیٹھ جائیں۔ سمجھ گئے ؟

لوگوں نے اسباب میں سر ہلائے۔ اس کے بعد اندو چوڑرن مختلف دستوں کو سمجھانے لگا۔ کون کہاں بیٹھے گا۔ اور کون کیا کرے گا۔ پوری تنظیم کس طرح ہو گی۔ جلسے کو کس طرح کنٹرول میں رکھا جائے گا۔ جب سب باتیں سمجھا چکا تو اس نے دستوں کو ہال سے باہر نکلنے کی اجازت دی۔

سب سے پہلے عورتوں کا دستہ باہر نکلا۔

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ہرگز ہرگز اس خلوص اور محبت کا مستحق نہ تھا۔ کوئی فرد بھی اتنی بڑی محبت اور اتنے گہرے اخلاص کا کیسے حقدار ہو سکتا ہے۔

دوسرا دستہ ٹریچور کے ساتھیوں کا تھا۔

تیسرے دستے میں شمالی طبار کے مزدور اور کسان ادیب گئے۔

یونیورسٹی لائبریری کا ہال بہت بڑا تھا۔ یہ پڑا ناٹرم کے بہادر طالب علموں کا دستہ مارچ کر رہا تھا۔ یہ کوئی لڑن کے رفیق تھے۔ ان میں جی فلپس بھی تھا۔ جس کی شادی کو ابھی تین ماہ بھی نہیں گذرے تھے۔ وہ مسکرا کے میرے قریب سے گذرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا یہ مجھے بہت عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس وقت تمہارے سامنے میں نہیں ہوں۔ ہمارا پورا ترقی پسند ادب ہے اور اس کا ذخار ہے مگر پھر بھی چونکہ میری ذلت اس میں الجھی ہے ....

جی فلپس مسکراتا ہوا میرے سامنے سے گذر گیا۔

یہ ایلی کے مندوب گزر رہے جا رہے تھے۔

اس طرح آٹھ دس بارہ پندرہ بیس آدمیوں کی ٹولیوں میں مندوبین حال سے باہر نکل گئے۔ اور پبلک پارک کو جانے والی سڑک پہ چلتے گئے۔ انہوں نے اپنی دھوتیاں جیسے وہ پنجابی تہمد کی طرح باندھتے ہیں۔ گھٹنوں تک اٹھا کے باندھ لی تھیں۔ اور اب بڑے مزے میں الگ الگ سڑک پہ چل رہے تھے۔ میں سب سے آخری دستے میں تھا۔

ہم لوگ جب پبلک پارک پہنچے تو وہاں بیس ہزار آدمیوں کا اور پولیس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کچھ سمجھ کے انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

میرے سامنے بیس ہزار آدمی تھے۔ میرے پیچھے شیوجی کا مندر
ا۔ پیچھے ماضی تھا۔ سامنے مستقبل اور میں ان دونوں کے بیچ
کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ وہ کونسی طاقت ہے جو اتنے آدمیوں
یہاں کھینچ لائی ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ عوام اپنے
دب سے پیار نہیں کرتے۔ یہ بیس ہزار آدمی یہاں کس لئے اکٹھے
ئے تھے۔ یہ میری جانب اٹھے ہوئے بیس ہزار چہرے مجھ میں
ا ڈھونڈ رہے ہیں۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ ان میں ہر شخص
یب تھا۔ ہر شخص اپنے چہرے پر ایک کہانی لکھ لایا تھا۔ یہ کہانی
ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہی جیسی تھی۔ ناشاد
زوؤں اور نارسیدہ امنگوں کی کہانی۔ ترسی ہوئی نگاہوں اور
لستے ہوئے ہونٹوں کی کہانی۔ صدیوں کے فاقوں کی بھوک کی بوسیدہ
سن کہانی جس میں محبت مرگئی اور عصمت لٹ گئی۔ اور معصومیت
کاری بن گئی۔ اس کہانی کو میں نے سب سے پہلے کشمیر میں دیکھا
۔ پھر پنجاب میں دیکھا، پھر دلی میں دیکھا، پھر بمبئی میں دیکھا
نگال میں دیکھا، پھر حیدرآباد میں دیکھا، اور آج اسے ترچنور

میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو وہی پرانی کہانی ہے۔ ہندوستان کے غریب انسانوں کی مظلوم کہانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یکایک کسی نے کہا۔ "انقلاب زندہ باد"

پھر یکایک جیسے یہ سارے چہرے بدل گئے۔ جیسے بیس ہزار چہروں سے ماضی کا غبار دھل گیا۔ اور شام کے شفق رنگ سائے ان بیس ہزار چہروں پر ایسے چمکنے لگے جیسے آسمان میں اڑتے ہوئے سفید بادل یکایک سورج کی کرنوں سے ٹکرا کے رنگین ہو جائیں اب ہر چہرہ مسرت سے کندنی اور گلابی تھا۔ یہ سرسبز اور شاداب چہرے محنت کشوں، لڑاکوں، جانبازوں کے چہرے، مزدوروں کسانوں، طالب علموں، اور ادیبوں کے بے باک نڈر بے خوف چہرے، تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو ، تم ہندوستان کا مستقبل ہو، شمال سے جنوب تک، اور مشرق سے مغرب تک آج ہندوستان کی تقدیر سرخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

جیسے میرے دل کی دھڑکن ، ان بیس ہزار دلوں کی دھڑکن میں کھو گئیں۔ اور میں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا

ساتھیو، دوستو، رفیقو!

نیلی پیشم کے اس پارچیرکل نام کا ایک تعلقہ ہے جو مدراس کے صوبے میں شامل ہے۔ اس تعلقہ سے چار نمایندے ہماری کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں سے تین شمالی ملبار کے کسان تھے اور چوتھا مزدور تھا۔ اور ادبی سیاسی مضامین لکھتا تھا۔ اس کا نام وی کرشنا تھا۔ باقی تینوں کے نام تھے۔ پی راگھون پی نارائن اور کے نارائن۔ جب ہم لوگ پبلک جلسے سے فارغ ہو کے اپنے ہوسٹل میں پہنچے تو یہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

پی رمن مینن جس نے کانفرنس میں ایک بار کیرلا کا ریزولیشن پیش کیا تھا۔ اور جو اکثر میرے ساتھ رہتا تھا۔ مجھ سے کہنا لگا۔ آپ کو شمالی ملبار کے جانباز مورچہ بالوں سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ آ بیٹے۔ آپ کو ان لوگوں سے ملا دیں۔

وی کرشنامیانہ قد، گٹھے ہوئے جسم کا مزدور تھا۔ اس نے ایک نیلی قمیض اور ایک نیلی نیکر پہن رکھی تھی۔ اور جب وہ مسکراتا نہیں تھا، تو شبہے سے گھورتا ہوا معلوم ہوتا تھا، لاکھوں کا کا چہرہ سیاہ تھا۔ اور پی نادائن کا رنگ گندمی تھا اور کے نالائن کا قد چھ فٹ سے اونچا نکلتا ہوا تھا۔ اور اس کے جبڑے اور اس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے معلوم ہوتے تھے چہرے مختلف تھے۔ لیکن مضبوطی کی چھاپ سب پر تھی مضبوطی۔ اور گہرائی اور آنکھوں میں تجسس کی چمک انہیں دیکھ کے گمان ہوتا تھا کہ یہ چہرے گویا سیاہ چٹانوں کو تراش کے بنائے گئے ہیں۔ گویا جیسے کیرالا کی چٹانیں ہیں۔ ویسے ہی کیرالا کے لوگ ہیں، جیسے کیرللکے درخت ہیں۔ ویسے ہی کیرالا کے لوگ ہیں۔ اور کناٹ کے سیدھے سخت تنے جو بڑے سے بڑے سمندری طوفان میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں اور اپنی جگہ سے اکھڑنے کا نام نہیں لیتے۔

وی کرشنا ہندی بھی اچھی خاصی جانتا تھا۔ اور بمبئی کا پونہ اور مدراس کی ملوں میں بھی کام کر چکا تھا۔ اس موقع پر اس نے ترجمان کا کام کیا۔ سب سے پہلے میں نے وی کرشنا سے پوچھا تم تو مزدور ہو۔ دن میں دس بارہ گھنٹے مزدوری کرنے کے بعد کیا تم میں اتنی سکت رہتی ہے کہ تم ادب میں دلچسپی لے سکو۔

وی کرشنا نے جواب دیا پہلے میں بھی ادب کو یونہی سمجھتا تھا

تفضیع اوفات پھر جوں جوں ہماری لڑائی بڑھتی گئی۔ ادب کے متعلق بہت سی باتیں میری سمجھ میں آتی گئیں۔ اور میں نے جان لیا کہ ادب بھی ہماری لڑائی کو آگے بڑھانے کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن میری آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب پولیس نے میرے گھر پر چھاپا مارا۔ اور میری لائبریری اٹھا کے لے گئی۔

تمہاری لائبریری؟ میں نے حیرت سے کہا۔

کرشنا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کے کہا میرے پاس پونے چار سو کتابیں تھیں۔ ان پر میں نے آٹھ سو روپے خرچ کئے تھے۔ یہ لائبریری میری پندرہ سال کی مزدوری کا گہنا تھا۔ پندرہ سال تک میں نے سینما نہیں دیکھا۔ میں نے اچھے کپڑے نہیں سلوائے، میں نے کبھی سگریٹ بیڑی نہیں پی۔ ان سے جو رقم بچتی رہی اسے جوڑ جوڑ کر کتابیں خریدتا رہا۔ پھر ایک دن پولیس نے میرے گھر چھاپہ مارا اور ساری کتابیں اٹھا کے لے گئی۔ اس میں جواہر لال نہرو کی کتاب DISCOVERY OF India بھی تھی اور پام دت کی انڈیا ٹوڈے INDIA TODAY سے بھی۔ پولیس جھاڑ و پھیر کر سب لے گئی۔ ایک ورق میرے لئے نہیں چھوڑا اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا ادب کس قدر قیمتی ہے۔ اور کسی قدر خطرناک بھی ہے۔ ملک معظم کی ملبار سپیشل پولیس بھی اس سے خوف کھاتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ کیا ملبار میں ابھی تک سپیشل پولیس تعینات ہے؟

راگھون نے کہا۔ وہ ہٹی کب تھی، جب کانگریس کا راج نہیں تھا جب بھی یہ پولیس ہمارے سروں پر موجود تھی۔

پی نارائن نے مسکراتے ہوئے کہا، اور کیا ہمارا علاقہ بھی تو سپیشل ہے۔ پھر ہمارے ہاں سپیشل پولیس کیوں نہ ہو، اس قدر پاپولر ہے وہ لوگوں میں، اور جب ملبار کے کسانوں نے "ہم دھان نہیں دیں گے" کی تحریک شروع کی تھی تو سب سے پہلے گولی ہمارے ہی سینوں پر چلی تھی۔ مگر اس گولی چلنے کا قصہ بھی بڑا عجیب ہے۔

کیا بات ہوئی تھی، میں نے پوچھا۔

لمبا، تر نگا کے نارائن جواب تک چپ تھا آہستہ سے بولا میں اس تحریک میں شامل تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس سال دھان بہت کم ہوا تھا۔ دسمبر میں بھی پیداوار بہت کم تھی۔ اور اس ستمبر میں بھی پیداوار بہت کم ہوئی تھی تمہارے یہاں دھان کی کیا دو فصلیں ہوتی ہیں۔

ہاں! کے نارائن نے مجھے بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا ہمارے ہاں مون سون کے دو موسم ہوتے ہیں۔ ایک موسم میں مون سون مشرق سے خلیج بنگال کی نم آلود ہوائیں اڑا کے لاتی ہے۔ دوسرے موسم میں بحیرہ عرب کی مون سون آتی ہے۔ پہلی پیداوار اگست ستمبر میں کاٹی جاتی ہے۔ دوسری پیداوار نومبر دسمبر میں۔ لیکن اس سال

تو ایسا ہوا کہ دونوں فصلیں بہت کم ہوئیں۔ اور کسانوں کو فاقے لگ رہے تھے۔

اچھا۔ تو تم نے دھان زمیندار کو دینے سے انکار کر دیا۔

جی نہیں ہم نے زمیندار کو تو اس کا حصہ دے دیا۔ لیکن اس بات پر ہوئی کہ وہ اپنے حصے کے علاوہ مندر کے لئے بھی دھان مانگتا ہے۔

مندر کے لئے؟

ہاں راجہ جی کے دو بڑے بڑے مندر ہیں، جن میں انھوں نے کئی ایک پجاری اور دیو داسیاں پال رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں جاتریوں، سادھوؤں اور بھک منگوں کے لئے لنگر بھی کھلے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے بھی دھان کسانوں سے لیا جاتا ہے۔ مگر جب ہمارے اپنے گھر والے ہی بھوکے مر رہے ہوں تو ہم لوگ مندر کے دیوتا اور اس کے پجاریوں کے لئے دھان کہاں سے دیتے۔ دھان انسانوں کے لئے تو کافی نہیں ہے۔ پتھر کے لئے ہم کہاں سے دیں۔

اس لئے ہم نے کہا۔ اگر بھگوان کو دھان کی ضرورت ہوتی تو وہ کسانوں کی فصل یوں برباد نہ کرتے۔

لیکن راجہ نے ہماری ایک نہ سنی ناچار تنگ آکر کسانوں

نے وہاں نہیں دیا گیا، اور تحریک شروع کر دی، اور اسپیشل پولیس نے ہم پر گولی چلائی تاکہ مندر میں وہاں پہنچ سکے۔ کسان کے بچے بھوکے مریں۔ لیکن پتھر کے بت چڑھاوا قبول کرتے رہیں ہماری ماؤں کے منہ میں اٹکے ایک کھیل بھی نہ جائے لیکن بے رحم خداؤں کے سامنے ناچنے والی دیوداسیوں کے قدم بدستور تھرکتے رہیں۔ محنت کرنے والے انسان مر جائیں۔ لیکن دوسروں کی محنت پر عیش کرنے والے دیوتا۔ بدستور اپنے مندروں اور محلوں میں بیٹھے رہیں۔

پھر کیا ہوا؟

پھر کیا ہوتا۔ ہم نے گولی چلنے کے بعد بھی وہاں نہیں دیا اور ہماری تحریک زور پکڑتی گئی۔ اب تو سنا ہے کہ راجہ جی کے مندر کے اندر بھی جہاں دیوتا کی مورتی رکھی ہے۔ وہاں پر بھی بجلی کے تار لگ گئے ہیں۔ اس پر چاروں کسان زور زور سے ہنسنے لگے۔

پھر وہ ایک دم چپ ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ اور میں نے بھی ان کی آنکھوں میں غم و غصہ اور نفرت کا ابلتا ہوا لاوا دیکھا۔ راگھون نے آہستہ سے کہا، مگر اسپیشل پولیس نے ہماری تحریک کو کچلنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا ہے۔ مندر کے میلے میں چار بیلوں میں جھگڑا کرا کے گولی چلادی۔ کوٹیاٹ میں ہماری عورتوں کی بے عزتی کی۔ ہمارے پاس ان عورتوں کے حلفی

بیان موجود ہیں۔ جو دنیا بھر کے بڑے بڑے حاکم کے پاس جا کر بھی اپنا بیان دینے کے لئے راضی ہیں۔ ہمارے ایک رکن نے خود کانگرس کے صدر پٹابی سیتہ رمیہ کے پاس جا کر یہ ساری باتیں لکھی تھیں اور کانگرس کے صدر کو مجبور ہو کر پولیس کے ان وحشیانہ مظالم کے خلاف بیان دینا پڑا تھا۔ جو اخبارات میں چھپا بھی تھا۔

کے نارائن بولا۔ جیسے وہ کسی سے نہیں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ چندر کوٹ کے گاؤں میں ہمارے ایک سرگرم کارکن ریڈیک کو پولیس نے پکڑ لیا۔ اور مار مار کر کئی جگہ سے اس کی ہڈیاں توڑ دیں بازوؤں اور پاؤں کی ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ اس کے گھر کو آگ لگا دی پھر جب اس کا ہرا بھرا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ تو اس پر ہل چلا دیا۔ وہ جگہ آج بھی اسی طرح موجود ہے۔

لیکن ریڈیک ابھی زندہ ہے۔ اور ہمارے ساتھ کام کر رہا ہے۔ وی کرشنا نے مسکرا کے کہا۔

کامریڈ آنندن کا قصہ بھی کس قدر عجیب ہے۔ پی نارائن

نے کہا۔

ہاں! ہاں۔ وی کرشنا نے جلدی سے کہا۔ ہاں بھئی وہ قصہ انھیں ضرور سناؤ۔

راگھوان نے کہا۔ ہوا یہ کامریڈ آنندن کو راجہ جی کے ایک غنڈے نے ہلاک کر دیا۔

ہلاک کر دیا؟ کیوں۔ میں نے پوچھا۔

بس کر دیا اس نے جواب دیا۔ کسانوں کا کام جو کرتا تھا یہ قصور کیا کم ہے، اور دوست ہلاک کرنے کی خبر پہ اس طرح چونکا نہ کہ وہ ہمارے یہاں ہلاک کر دینا اور ہلاک ہو جانا بہت معمولی بات ہے۔ روز ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس سے تحریک نہیں ملتی۔ کچھ آگے ہی بڑھتی ہے۔

تم اصلی بات سناؤ۔ وی کرشنا بے چین ہو کے بولا۔

راگھون بولا۔ جب اس غنڈے کے راجہ جی کے کہنے پر آنندن کو ہلاک کر دیا۔

میں نے کہا۔ ٹھہرو یہ بتاؤ اس غنڈے کا کیا نام ہے؟

راگھون بولا۔ میں جانتا ہوں۔ اس غنڈے کا نام کیا تھا۔ مگر میں تمھیں بتاؤں گا۔ کیونکہ غنڈے کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ غنڈہ، غنڈہ ہوتا ہے۔ اس کا نام بتانا نام کی بے عزتی کرتا ہے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ جو نام اس غنڈے کا ہے۔ وہی نام ہمارے ایک بہت

اچھے رفیق کا ہے۔ اس لئے میں اس غنڈے کا نام نہیں بتاؤں گا۔ بس یہی سمجھو کہ کامریڈ آنندن نے اس غنڈے کو مار ڈالا ہے۔ اور راجو جی سے اپنا نام حاصل کر لیا۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی کو لے کے کامریڈ آنندن کے گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں میں چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد وہاں سے بھی نکالا گیا۔ اور اس طرح سے اب راجو جی کے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں جاتا ہے۔ لیکن کہیں اس کے پیر نہیں ٹکتے۔

کیوں؟

راگھون نے ایک لمحہ رک کے میری طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھ کے کہا: اس کی بیوی کو اب ہر روز دورہ پڑتا ہے۔ حال آتا ہے، حال آتے ہی وہ آدمی سر ہلاتا جاتا ہے۔ اور منھ سے جھاگ بہنے لگتی ہے۔ اور وہ اہی تباہی بکنے لگتا ہے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بس یہی حال اس غنڈے کی بیوی کا بھی آتا ہے۔ اور وہ اس حال کے وقت چیخ چیخ کے لوگوں سے کہتی ہے۔ میں آنندن ہوں میں آنندن ہوں۔ . . . . .

اور جب وہ زور سے چیختی ہے تو غنڈہ پریشان ہو کے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ یا اپنی بیوی کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتا

یا اسے دھڑا دھڑ لگ جاتا ہے۔

پھر؟ — پھر کیا ہوا۔

پھر ایک روز بہت پریشان ہو کے اس غنڈے نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنی بیوی اسے سچ مچ بہت پیاری تھی۔

کمرے میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ پھر کے نارائن نے رات کے سناٹے کو توڑتے ہوئے شہد کی مکھیوں کی سی گونجدار آواز میں کہا۔

یہ مت سمجھنا کہ ہمارا دل صرف ظلم ہی ظلم ہے۔ اور ہم لوگ ظلم سہتے ہوئے اس حد تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر کل تعلقے کا کسان ایسا بزدل نہیں ہے۔ وہ ابھی تک اسی پرانی بے جگری سے لڑ رہا ہے۔

اور مزدور کو تم کیا سمجھتے ہو۔ وی کرشنا نے بڑھ کے کہا یاد ہے سمویل آئرن کے موتی کارخانے میں ہم لوگوں نے جہازیوں

لی ہڑتال کے وقت ہمدردی کے طور پر ایک سو پانچ روز کی ہڑتال
ی تھی۔

ایک سو پانچ روز ؟ میں حیرت سے چیخ پڑا۔

وی کرشنا میری حیرت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اب بالکل چپ ہو گیا۔ اور ساتھی کسانوں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ اب کہتے جاؤ تم اپنی کہانی۔ لیکن کیا تم کبھی اس کا مقابلہ کر سکتے ہو؟

کے نارائن نے کہا ہم نے بھی ایک چھوٹا سا آزاد قلعہ بنایا تھا بری وتور کے مقام پر جب ہماری تحریک زوروں پر تھی۔ وہاں یک ماہ تک سپیشل پولیس کا آدمی ہمارے علاقے میں اندر آنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ پورے تیس دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گو اب حالت دوسری ہے۔ لیکن دن کو اب بھی وہ لوگ وہاں نہیں آ سکتے۔ رات چھاپہ مارتے ہیں۔ اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ دن میں کسے اب بھی مقابلہ کرنے کی جرات نہیں ہے۔

پی نارائن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہماری عورتوں نے بھی مارنی لڑائی لڑائی میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ چیچی کے جاگیردار نے جب ؤں والوں کو جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کو منع کر دیا تو عورتوں نے س کے خلاف احتجاج کیا۔ اور چیچی کے جاگیردار نے پولیس بلائی ور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کے واپس آتی ہوئی عورتوں پر حملہ کیا

تو عورتوں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پولیس والوں کو اپنے نرغے میں لے کے انھیں اپنی کلہاڑی کے چوبی دستوں سے وہ پیٹا کہ بے چاروں کو جان بچا کے بھاگنا مشکل ہو گیا۔ کئی پولیس والے اپنا ڈنڈا، ٹوپی تک وہیں بھول گئے۔ بعد میں گاؤں والوں نے وہ چیزیں تھانہ میں پہنچا دیں۔

دی کرشنا بولا۔ ارے بڑا مزہ رہا۔ سچ مچ۔

وہ تینوں کسان ہنسنے لگے۔ ہم لوگ بھی ان میں شریک ہو گئے۔ اور رات کے گہرے اندھیارے میں چوٹ کھائے ہوئے چہروں پر نور کی مشعلیں روشن ہو گئیں۔

میں نے دی کرشنا سے پوچھا۔ کانفرنس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ اس نے سوچ سوچ کر جواب دیا۔ "کانفرنس میں اپنا پن تھا"۔

پھر میں نے سوچ سوچ کر باقی کے تین کسانوں سے مخاطب ہو کے کہا۔ میں بمبئی لوٹنے پر شمالی ملبار کے کسانوں کا ایک پیغام اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔

ان تینوں کسانوں نے میری طرف دیکھا، پھر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ جیسے کوئی سر ہلا رہا ہو۔ اور کوئی انکار کر رہا ہو۔ اور کوئی اور ہی بات بتا رہا ہو، پھر ان تینوں

کے سر ایک ساتھ ہلے۔ اور انھوں نے ایک وی کرشنا کی طرف دیکھ کے اُسے کچھ کہا۔

وی کرشنا نے مجھ سے کہا۔ بمبئی والوں سے کہہ دینا کہ چر کمل تعلقہ کا کسان آج بھی سر اٹھا کے چل سکتا ہے کیا

رات بہت گہری ہو چکی تھی۔ اور ہوٹل کے اس بڑے کمرے میں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے پیارے دوست فرش زمین پر پڑ کر سو گئے۔ میں کروٹ بدل کر جاگتا رہا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ پھر کبھی میں جلتے ہوئے گھر دیکھتا۔ کبھی چٹختی ہوئی ہڈیاں کبھی کبھی سمندر کی سیڑھیوں پر چلتی ہوئی گولیاں۔ پھر میرے کانوں میں آواز آتی ہے میں آنند بھون ہوں، انند بھون ہوں اور کوئی خندہ زن لبوں سے قہقہے لگانے لگتا پھر میں اٹھ کر رفیقوں کے چہرے دیکھنے لگتا۔ جنہوں نے سچی آزادی کی لڑائی کے مورچے پر اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

دن میں شاید آدمی ایک نقاب پہنے رہتا ہے۔ اور اس کے چہرے پر بہت سی باتیں نظر نہیں آتیں۔ لیکن جب رات آجاتی ہے جب نیند سے بوجھل پلکیں رخساروں پر جھک جاتی ہیں۔ اس وقت آدمی کے اندر کی بہت سی تصویریں جاگتی ہیں۔ خفیہ جذبات پوشیدہ

حسرتیں، نا آسودہ آرزوئیں، بیتے ہوئے دنوں کے گناہ، اور آنے
والے دنوں کے رجحان۔ سب جاگنے لگتے ہیں، اور سونے والے
کے چہرے پر اپنی کشمکش کی ایسی تصویر کھینچ دیتے، جو اکثر اوقات
ان کو نظر نہیں آتی۔ اس لیئے میں بھی بڑی حیرت سے یہ چہرے
دیکھ رہا تھا۔ جو کسانوں کے مورچے سے آئے تھے۔ اور صبح ہوتے
ہی پھر اسی مورچے پر چلے جائیں گے۔ ان چہروں پر بھی پوشیدہ حسرتیں
اور نا آسودہ آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ ان میں بہادری تھی۔ اور رضیہ طی
لیکن اس کے ساتھ میں ان کے چہرے ایک عجیب سے سنہرے
خواب کا پرتو دیکھا۔ جس نے ان چاروں چہروں کو ایک دوسرے
سے مختلف رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب اس قدر
قریب کر دیا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ چاروں ایک ہی ماں کے
بیٹے تھے۔ جیسے ان میں اور مجھ میں بھی اسی سنہرے خواب کا رشتہ
تھا۔ وہ سنہرا خواب جو میں نے ایک بار لینن کے چہرے دیکھتا تھا
ایک بار سٹالن کی مسکراہٹ میں پایا تھا۔ ایک بار شہید ہوتین
وان کی بے نور آنکھوں میں منجمد دیکھا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ انسان
کس قدر بڑا ہے۔ کس قدر عظیم ہے۔ جو پہلے اس خواب کو کسی کتاب
کے ایک ورق میں، تصویر کی ایک جھلک میں، سینے کے کسی افق پر
جھلملاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور پھر اپنی زندگی کی ساری کاوشوں
سے اس سنہرے خواب کو دھرتی پر تعمیر کرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ تاج

بن جاتا ہے اور ایندھن اور وجود میں آجاتا ہے۔ تپتا ہوا صحرا سبز ہو جاتا ہے، اور کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے لگتا ہے۔ اور مزدور کارخانوں میں حکومت کرنے لگتے ہیں۔ اور ندی نالوں کے رخ پہاڑوں کے گوشے اور ہواؤں کے مزاج بدل جاتے ہیں، انسانوں کی محنت سے ایک نئی دنیا، ایک نئی قدرت، ایک نئی فطرت جنم لیتی ہے۔

میں دیر تک جاگتا رہا، رات ڈوبتے ڈوبتے ڈوب گئی، تارے ایک ایک کر کے فضائی تنہائی میں گم ہوتے گئے، آخر جب افق پہ سفید ہوائی پھر سنے لگی۔ تو کسی نے قریب کے گھر سے ستار پہ آسا کا دھیما الاپ شروع کیا۔ اور چاروں طرف صبح ہوتی گئی۔

پانچ بجے کے قریب رمن نے آ کے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ میں نے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ رمن اندر آتے ہوئے کہنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے تم سوئے نہیں۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ تمہاری گاڑی چھ بجے تک یہیں رکو گے یا سٹیشن چلو گے؟

میں نے کہا چلو سٹیشن چل کے گاڑی کا انتظار کریں گے۔

اسٹیشن اندھیرے میں ایک چھوٹا سا شیڈ معلوم ہو رہا تھا۔ تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں لوگ اکڑوں سوئے رہتے ہیں۔ دوسرے درجے کے مسافر خانے میں پرانی وضع کی منقش ساگوان کی کرسیاں اور میزیں تھیں، اور ایک سفید گلوب والا لیمپ روشن تھا۔ باتھ روم میں چینی کے جگ دھرے تھے اور سنگھار میز کے بیچ میں ایک بڑا جگ پانی سے لبا لب بھرا ہوا رکھا تھا۔ پانی کے اوپر مکڑی نے جالا بنا دیا تھا۔ اس مسافر خانے میں اٹھارویں صدی کا منظر تھا۔ جب کمپنی

بہادر کے صاحب اور ان کی عورتیں یہاں آ کے گھڑی دو گھڑی کے لئے ٹھہرتی تھیں۔

رمن نے کہا تم ناشتہ کر لو۔ گو اس وقت تمہیں بھوک نہیں ہوگی۔ مگر پھر بھی تم ناشتہ کر لو۔ رستہ میں تمہیں اتنا اچھا ناشتہ کہیں سے نہیں ملے گا۔ قریب ہی یہاں ایک اتنی اڈلی ملتی ہے کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔

میں اور رمن اس جگہ گئے جہاں املی کے نیچے ایک تاریک شیڈ تھا، اور ایک اس سے بھی تاریک لیمپ تھا۔ جو روشنی کے بجائے سیاہی پھیلا تھا۔ شیڈ سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ اور دو تین مسافر جیسی آوازیں ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے اڈلی کی گرم گرم تازہ خستہ خوشبو جب میرے نتھنوں میں پہونچی تو میری اشتہا چمک اٹھی میں نے ایک بہت بڑا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے رمن سے کہا،

"تم بھی کھاؤ"

وہ بولا۔ "میں اس وقت ناشتہ نہیں کرتا"

میں نے کہا۔ میں کہاں کرتا ہوں۔ اتنا کہہ کے میں نے لڑکے کو آواز دی۔ ایک ناشتا اڈلی لاؤں۔

میں نے اپنی بات کچھ تو ہاتوں میں کچھ اشاروں میں اور کچھ اپنی گول مول مہمل ہنسی سے پورا کیا۔ لڑکا ہنسنے لگا۔

رمن نے لڑکے کو ناشتے کے لئے منع کر دیا۔
میں نے کیلے کے پتے کو جس پر ناشتہ رکھا تھا۔ اپنے سامنے سے ہٹا کے کہا اچھا تم نہیں کھاتے تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔
رمن ہنسا۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر مجھ سے کہا۔ ساتھی یہ بات نہیں ہے کہ میں ناشتہ کرنا نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میں ان میں صرف ایک ہی وقت کھانا کھاتا ہوں
ایک وقت کیوں کھاتے ہو جی ۔ ؟
رمن نے کہا۔ اس لئے کہ دو وقت کھانا کھانے کی مجھ میں توفیق نہیں ہے۔ میں چونکا۔ رمن کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔
رمن تھوڑے توقف کے بعد پھر کہنے لگا، بہت ساتھیوں کا اس سے کچھ برا ہی حال ہوگا۔ کبھی ہم لوگ کام کے لئے باہر نکل جاتے ہیں تو وہ دو دن کھانا نہیں ملتا اور تم جانتے ہو کہ گاؤں کے کسان کتنے غریب ہوتے ہیں، اور میں تم سے کہتا ہوں جنوبی ہند کا کسان تو بہت ہی غریب ہے۔ ہم اس سے اپنے لئے کھانا نہیں مانگ سکتے غلط ثابت ہوگی۔ رمن نے کہا اس لئے میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ ورنہ عادت بگڑ جائے گی۔ بڑی مشکل سے یہ عادت ڈالی ہے۔
میں نے چپ چاپ اپنا ناشتہ ختم کیا۔ پھر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اسٹیشن کی طرف چلنے لگے۔ رستے میں ابھی اندھیرا تھا۔ لیکن کہیں کہیں پرندے درختوں سے پھڑ پھڑاتے

ہوئے اٹھتے اور آسمان کے اجالے میں سیاہ تیتریاں بنائے ہوئے اڑ جاتے، کہیں کہیں کسی کسی جھاڑی کے پاس النچی کے پھولوں کی تیز خوشبو آجاتی ہے۔

یکایک رمن نے کہا۔ یہ النچی کے سفید چھوٹے چھوٹے پھول ہماری چھوٹی چھوٹی محبتوں کی یادگار ہیں۔ شاعروں نے ان پر شعر کہے ہیں عاشقوں نے ان کے ہار پروئے ہیں۔ محبوب نے انھیں اپنے بالوں میں لگایا ہے۔ جب میری شادی ہوئی تھی۔ رمن یکایک چپ ہوگیا۔

بہت دیر کے بعد میں نے پوچھا۔ تمہاری بیوی کہاں ہے

بہت دیر کے بعد وہ بولا۔ میری بیوی اور میرا بچہ...... کبھی یہاں........ کبھی وہاں....... کبھی اس ساتھی کے گھر... کبھی اس کسان کے گھر پناہ لیتے ہیں۔

رمن نے جھک کر راستے سے ایک پتھر اٹھا لیا۔ اور اسے ایک درخت کے تنے کی طرف زور سے پھینک کر بولا۔ سارا جنوبی ہند ہمارا گھر ہے۔

پتھر زور سے اس درخت کے تنے سے ٹکرایا۔ اور وہاں سے اچھل کر ایک جوہڑ میں جا گرا۔ پتھر کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔ "تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے"

تریچور سے وہ مقام زیادہ دور نہیں۔ جہاں ملیالم زبان کے
سب سے بڑے شاعر ولاتھول رہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا
خوبصورت گاؤں ہے۔ اسے نیبر نتھ ڑتھی کہتے ہیں۔ یہ گاؤں چھوٹی
چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس کے کنارے بھارت
ندی بہتی ہے۔ ولاتھول کا گھر کیلے کے کنجوں سے گھرا ہوا ٹھنڈا
اور پرسکون ہے۔ صاف ستھرے مویشی خانے سے تازہ بھوسی
کی مہک آ رہی ہے۔ اور دودھیلی گائیں زبان نکال کر اپنے پیارے
بچھڑوں کے ماتھے چاٹ رہی ہیں۔ آنگن میں بچوں کا شور ہے۔ اور
کبھی کبھی ولاتھول کے خاندان کی عورتیں، دھیمے دھیمے سروں میں باتیں
کرتی ہوئی ہنس پڑتی ہیں بستے ہوئے گھر کے اندر جو پاکیزگی ہوتی
ہے اور اپناپن ہوتا ہے، انسان اور اس کی محبتوں کے جو سارے
رشتے ناطے اور سمبندھ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تمام دلکشی لئے ہوئے
یہاں موجود ہیں، اور میں جو اس وقت گھر سے بہت دور ہوں
اور دن رات سفر میں ہوں اسے خاص طور پر محسوس کر لیتا ہوں

اور اندو چوڑن کے میٹھی مسکراہٹ وہ اسے شرمیلے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیتا ہوں اور جو میرے اپنے بیٹے ہی کی طرح معصوم اور دلکش ہے۔ پہلے تو وہ میری گود میں نہیں آتا۔ پھر آجاتا ہے۔ تو اپنا نام نہیں بتاتا۔ نام بتاتا ہے تو اپنے ہاتھ کا کھلونا میرے حوالے نہیں کرتا۔ پھر جب وہ کھلونا بھی میرے حوالے کر دیتا ہے تو میں اسے چوم لیتا ہوں۔ اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے پکے دوست بن جاتے ہیں۔

ولاتھول جوش صاحب کی طرح اک پُر وقار اور وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں۔ جوش صاحب کی طرح ہی انھوں نے قومی تحریک کے گیت گائے ہیں، اور مزدوروں اور کسانوں کی تحریک میں رومانی انقلاب پرستی تک ساتھ دیا ہے۔ ولاتھول کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہے۔ ان کی آواز گہری اور گونجدار ہے۔ اور وہ اس وقت ایک سفید رنگ کی دھوتی پہنے ہوئے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے میری طرف دیکھ کے اشارے کر رہے ہیں۔ اور مسکراتے جا رہے ہیں۔ ولاتھول انگریزی، اور اردو یا ہندی نہیں سمجھتے اور میں ملیالم سے ناآشنا ہوں۔ اس لئے ہماری گفتگو گوندن کروپ کے ذریعے ہوتی ہے۔ جو ولاتھول کے بیٹے ہیں۔ اور جن کی آنکھوں میں گہرے سوچ بچار کی جھلک ہے۔

گوندن کروپ کہتے ہیں، تاجی کہتے ہیں، آپ کو تو میں اپنا ہم عمر

سمجھتا تھا۔ آپ تو بہت چھوٹے نکلے اس پر میں اور اندو چوڑن جو لاتھوں کے داماد ہیں مسکرانے لگے۔

اچھوت گروپ، گوندن گروپ اور ولاتھول کے دوسرے بیٹے اور ان کے داماد اندو چوڑن اشتراکی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے ہیں، اور ولاتھول سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، کیونکہ وہ مدراس سرکار کے مہاکوی ہیں، اور اس سلسلے میں ایک ہزار روپیہ سالانہ پاتے تھے۔ صرف ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ پاتے ہیں صرف ایک ہزار روپیہ سالانہ! میں نے پوچھا اس حساب سے تو ان کی ماہانہ تنخواہ چوراسی روپے سے بھی کم پڑی اور میرے خیال میں تو بمبئی کارپوریشن کا مہتر اس سے زیادہ تنخواہ لیتا ہوگا۔ میں ایک مہتر کے کام کو اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں، جتنا ایک شاعر اور ایک وزیر کے کام کو لیکن پھر تنخواہوں میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ مدراس سرکار کا وزیر تو ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ پائے۔ اور اس کا مہاکوی چوراسی روپے ماہانہ، کانگرسی سرکار نے کیا کلچر کو فضیلت بخشی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے۔ اتنے سستے داموں ایک عوامی شاعر کا ایمان لوٹ لیا۔ اندو چوڑن نے کہا یہ بات تو صحیح ہے لیکن اسی چیز کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے، اور ہمارے ہی گھر میں، دراصل ولاتھول کے ماضی کی بہت سی شاندار روایات بھی ہیں۔ لیکن جب اپنے طبقے سے تعلق توڑنے کا موقع آیا

تو کچھ تو وہ اپنے سن و سال کی وجہ سے اور کچھ بورژوائی قومی تحریکوں سے گہری دلچسپی رکھتے ہوئے آگے نہ بڑھ سکے۔ متوسط طبقے کی یہ ٹریجڈی کئی بار دہرائی جا چکی ہے۔ اور شاید ابھی اور کئی بار دہرائی جائے گی۔

والاتھول ایک پرانے درخت کی طرح ہمارے سروں پر کھڑے ہماری گفتگو سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن چونکہ وہ اونچا سن رہے ہیں، اسلیئے سمجھ نہ سکے کہ ہم لوگ کیا بحث کر رہے تھے۔ انہوں نے دھیرے سے ہمارے شانے کو ہاتھ لگا کے گووندن کروپ سے کچھ کہا۔

گووندن کروپ نے مجھ سے کہا تباجی کہتے ہیں مجھے بڑا افسوس ہے ان دنوں ہمارا ناچ گھر چھٹیوں کی وجہ سے بند پڑا ہے ورنہ ہم آپ کو کتھا کلی کے اصلی ناچ دکھلاتے۔

گووندن کروپ نے اپنی بہن کی طرف اشارہ کرکے کہا یہ ہماری سب سے چھوٹی بہن ہے۔ اور وہ بہت اچھا ناچتی ہے۔

چھوٹی بہن نے ہنس کر، اندوچوڑن کے بچے کو مجھ سے لے لیا، اور کہا چلیئے کھانا تیار ہے۔

میں سفر کا تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھا کے بہت جلد سو گیا۔ جب اٹھا تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ اور دھوپ ماند پڑ چکی تھی، چاہے پی کر ہم لوگ بھارت ندی کے پل پہ جا کے کھڑے ہو گئے۔ جس کے اس پار شورنور کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ شورنور کے اس پار اونچی اونچی گھاٹیاں تھیں۔ اب سورج نیچے اتر آیا تھا۔ اور بھارت ندی کی سطح پہ چمک رہا تھا۔

اندو چوڑن مجھ سے کہنے لگا۔ ان گھاٹیوں کے پرے موپلاؤں کا دیس ہے۔ موپلا بغاوت کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

موپلا لوگ مسلمان ہیں، اور غریب ہیں۔ جب انہوں نے بغاوت کی تو یہ ایک خالص کسان بغاوت تھی، لیکن جلد ہی اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا گیا۔ کیونکہ موپلا مسلمان تھے۔ اور ان کی زمینوں کے مالک ہندو تھے، لیکن یہ فرقہ وارانہ کشمکش نہ تھی۔ بنیادی طور پہ یہ کسانوں کی بغاوت تھی۔ زمینداروں کی خواہش یہ تھی کہ زمیندار ہندو تھے۔ اور ان کے مزارع مسلمان تھے۔ اس لئے اخبار میں اس تحریک کو فرقہ وارانہ سیاست کا رنگ دے دیا گیا۔ لیکن شروع شروع میں یہ تحریک صحیح راستے پہ جا رہی تھی۔ کئی ہندو کسان بھی ان کے ساتھ شامل تھے، اور ایک بار جب سپیشل پولیس نے موپلاؤں پہ حملہ کیا اور انہیں شکست کھانی پڑی تو پولیس کے کئی ایک برہمن کلرک

بھی موپلاؤں کے ہتھے چڑھے۔ لیکن موپلاؤں نے ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ انھیں اپنے کیمپ میں شامل کرلیا۔ جہاں وہ بدستور اپنے ٹائپ رائٹروں پر موپلاؤں کے لئے وہی کام کرتے رہے، جو وہ اس سے پہلے سپیشل پولیس کے لئے کیا کرتے تھے۔

یہ سپیشل پولیس کونسی بلا ہے؟ میں نے پوچھا۔

یہ سپیشل پولیس انگریزوں کے وقت سے ان موپلاؤں کو کچلنے کے لئے رکھی گئی تھی، اس تحریک کو بڑی سختی سے دبا دیا گیا ایک بار گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے اس علاقے کا دورہ کیا تھا لیکن اس دن کے بعد سے کوئی قومی رہنما اس طرف نہیں بھٹکا اور یہ تحریک غلط ہاتھوں میں چلی گئی، مگر پھر بھی بنیادی طور پر یہ تحریک ایک اچھے مقصد کو لے کر چلی تھی۔ موپلاؤں نے اپنی تحریک کے دوران میں بڑے بڑے ظلم سہے ہیں۔ کمانڈر HITCHCOCK کے مظالم کے ملبار میں مشہور ہیں، جب موپلاؤں نے اسے بھی قتل کردیا۔ تو انگریزوں نے عوام کے اس سب سے بڑے دشمن کا بھی میموریل بنایا۔ جو آج بھی (   ) میموریل کے نام سے مشہور ہے اس سے پہلے کانگریسی کہتے تھے۔ کہ وہ طاقت حاصل کرتے ہی اس میموریل کو ہٹادیں گے۔ لیکن طاقت حاصل کرکے تو انھوں نے اس میموریل کو ہٹایا۔ اور نہ ہی اسپیشل پولیس کو موپلاؤں کے دیس سے باہر کیا۔

تو کیا اُس زمانے کی سپیشل پولیس ابھی تک اس علاقے میں ہے؟

ہے کیا اُس سے بھی بڑھ کے کام کر رہی ہے، وہی پرانے حکومت کے طریقے ہیں، صرف آزادی نئی ہے۔

پل کے پار شورنور جنکشن سے گاڑی کی ٹننٹنگ کی آواز سنائی دی۔ اندوچودرن پل کے جنگلے پہ جھک گیا۔ اور بھارت ندی کے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا تحریک کے زمانے ہیں اسی شورنور کے جنکشن پہ ایک بار ڈیڑھ سو موپلا کسانوں کو مال گاڑی کے ڈبے میں بند کر دیا گیا۔ یہ کسان یہاں سے کوئمبٹور لیجائے جا رہے تھے جہاں ان پر مقدمہ چلایا جانے والا تھا۔ اس سو پچاس کسان ایک چھوٹے سے ڈبے میں جانوروں کی طرح بند کر کے کوئمبٹور بھیج دیئے گئے۔ وہاں جا کے جب ڈبہ کھولا گیا تو آدھے سے زیادہ موپلا کسان مر چکے تھے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے حقیقت ہے۔ اس زمانے ادھر ادھر کے سارے اخباروں میں آچکا ہے۔

گووندن نے آہستہ سے کہا۔ انگریز سراج الدولہ کے بلیک ہول کا تذکرہ بار بار کرتے ہیں۔ لیکن شورنور کے بلیک ہول کا کبھی تذکرہ نہیں کریں گے۔

انسانیت کو اشتراکیت تک پہنچنے کے لئے جانے ایسے کتنے بلیک ہولوں سے گذرنا پڑے گا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ بھارت ندی کی سطح پر لاکھوں تارے جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ شورنور جنکشن پر ایک انجن شنٹنگ کر رہا تھا۔ ایک گاڑی کوچین جا رہی تھی۔ سیاہ گھاٹیوں کے پڑے موپلا کسان ابھی تک اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے۔ بھارت ندی کے پل پر سے کیرالا کی حدود ختم ہوتی ہیں اور مدراس کی شروع ہوتی ہیں۔ پل پر آبکاری والوں کا پہرہ تھا۔ آبکاری کے سپاہیوں نے ماتھے پر چندن کے ٹیکے لگا رکھے تھے۔ میں نے سوچا شراب کی بندش تو ہوتی ہے۔ لیکن ظلم کی بندش کیوں نہیں ہوتی۔ کیونکہ سپیشل پولیس آج بھی موپلاؤں کے دیس میں موجود ہے۔

گاڑی ہف ہف کرتی بہت دور چلی گئی۔ پل کے اس پار سے ایک گاڑی بان اپنی بیل گاڑی میں بیٹھا ہوا گاتا ہوا ادھر آرہا تھا گووندن نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ موپلاؤں کا رہنما بھی ایک گاڑی بان تھا ایک غریب مزدور گاڑی بان۔۔۔۔۔۔۔ اس کا نام تھا کنجو احمد حاجی اس کی تنظیم کی انگریز بھی داد دیتے ہیں، اس کے سر کے لئے بڑا انعام رکھا گیا تھا۔ لیکن وہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔ آخر سامراجیوں نے اپنی پرانی چال چلی ــــ اس سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے گا تو اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا۔ اور جب کنجو احمد حاجی نے اس چال میں آکے اپنے آپ کو سپیشل پولیس کے حوالے کر دیا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

بالکل ایسا ہی گاڑی بان تھا وہ۔ گووندن نے بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے گیت گاتے ہوئے گاڑی بان کی طرف دیکھ کر کہا۔

گاڑی بان ہمارے سامنے سے گیت گاتا ہوا گذر گیا۔

پردیشی پونیم ٹپالم ونٹم
پھر کارنا ڈے کو رٹینم

لوگ کہتے ہیں پردیسی چلے گئے
اور سپاہی واپس بلا لئے گئے ہیں

پراٹیمہ ناٹو کار پاڈمان بگڑے اور اب اپنی حکومت ہے۔
پر منڈے اچھتے تو ک بنو تو کیا پھر بھی ہمارے غریب پربان کے
باپ کو پھانسی پہ چڑھایا جائے گا۔

یہ بھی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں
نے گووندن سے کہا —— ہمیشہ ایک گاڑی بان دوسرے گاڑی
بان کی طرح بنتا ہے ۔

الوائی جانے والی گاڑی میں سفر خاموشی سے کٹا۔ میرے ڈبے
میں دو پادری تھے۔ جن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ کرسمس منانے
ڈٹانیم جا رہے ہیں۔ ایک آدمی الوائی کے مضافات میں لاریوں کا ٹھیکیدار
تھا۔ جس نے سنہرے کنارے کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اور سنہرے کنارے
کی سفید دھوتی اور جس کے چہرے پر چھدری چھدری داڑھی تھی۔ اور
وہ میری طرف بار بار دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اس کے چہرے کی رقیق
لیپی خوبصورتی اور اس کی کھینچو مسکراہٹ مجھے قطعاً پسند نہیں آئی
اس لئے میں نے اسے مسکرانے دیا۔ اور خود کھڑکی سے باہر کے مناظر
دیکھ رہا تھا۔ جو کھڑکی کے اندر کے مناظر سے زیادہ دلچسپ تھے
غرضیکہ ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد الوائی قریب آنے
لگا۔ تو اس آدمی سے نہ رہا گیا۔ اس نے میرے شانے کو ہاتھ لگا
کے اپنی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر دیا۔
میں نے پوچھا کیا بات ہے۔

آپ؟ آپ کرشن چندر ہیں۔

جی ہاں!

میں آپ کو جانتا ہوں۔

کیسے جانتے ہیں۔

آپ نے تریچور میں لیکچر دیا تھا۔

جی ہاں۔

اس نے بڑی نرمی سے مسکرا کر میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے میں نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ بولا میں الوائی میں لاریوں کا ٹھیکیدار ہوں

میں نے کہا اچھا ہوا آپ نے مجھے بتا دیا ورنہ میں تو آپ کو سوامی وویکانند کا چیلہ سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک دم چونکا پھر سنبھل گیا میں تو الوائی کے مضافات میں لاریوں کا ٹھیکیدار ہوں۔ بڑی بڑی سڑک پر سرکاری لاریاں چلتی ہیں۔ میرے پاس گیارہ لاریاں ہیں جی......

نشتر کی نوک "میری" ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد وہ گیارہ ہیں۔

میں نے بات پلٹ کے کہا۔ تریچور میں میں نے جو کچھ کہا اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وہ بڑے میٹھے لہجے میں ہنس کر بولا۔ بڑے اچھے خیالات ہیں آپ لوگوں کے۔ اگر معاف کریں تو ...... آپ لوگوں کی تعلیم کمزور ہے۔

اب میں چونکا۔ وہ کیوں...... کیسے؟ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ اگر جی آپ کی تنظیم اچھی ہوتی تو میرے پاس گیارہ
ریال کیسے ہوتیں آج تک؟ ...... اچھا مجھے اجازت دیجئے
لوائی آگیا۔

اس نے بڑی لجاجت سے پھر ہات جوڑے اور ہینڈ بیگ
تھ میں لے کر نیچے اتر گیا۔

اترنا مجھے بھی تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں اس کی گردن مروڑ
۔ اس کی ساری رفیستی خوبصورتی اچھی طرح نچوڑ لینا چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا
ی تک اس کی یادداشت بہت تھی۔ وہ ہمیں نچوڑ رہا تھا۔ اور نچوڑ کر یوں
ینک رہا تھا، جیسے لاریوں کے پرانے پرزے،
کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں
بھی سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور جاتے جاتے میں نے
ا سے کہا، ٹھیک ہے ارجی، تمہاری ہر لاری کے اندر ہمارا ڈرائیور
ہا ہوا ہے۔ سمجھ لیا آپ نے جی۔

لیکن اس نے مڑ کے نہیں دیکھا جی!

الوائی ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں پر کھاد بنانے کا کارخانہ

اور ایلومینیم کے برتن ڈھالنے کی ایک کمپنی ہے۔ جو سارے ہندوستان
میں اپنا مال بیچتی ہے۔ یہاں اس قدر ایلومینیم نہیں ہوتا، جو سارے
کارخانے کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس لئے کمپنی والے دساور
سے کچا ایلومینیم منگاتے ہیں۔ کچا ایلومینیم باہر سے منگانے کے بھی یہاں
کے کارخانے داروں کو فائدہ رہتا ہے۔ کیونکہ ایک تو مزدوری سستی
ہے اور دوسرے بجلی بھی بہت سستی ہے۔ اور الوائی سے پچاس میل
کے فاصلے پر بجلی واصل ہائیڈرو پراجیکٹ سے آتی ہے۔

الوائی سے سرکاری بس میں بیٹھ کر کوٹائم کو جاتے ہیں۔ کوچین اور
ٹراونکور کے انضمام کے بعد یہاں بس سروس کو سرکاری ملکیت بنا دیا
گیا ہے (سرکاری ملکیت جسے اکثر لوگ غلطی سے قومی ملکیت کہتے ہیں)
سٹیٹ ایکسپریس (سگریٹ نہیں لاری) کوئی ساڑھے گیارہ بجے دن
کو الوائی سے کوٹائم کو جاتی ہے۔ کوٹائم عیسائی بورژوازی کا گھر سمجھا جاتا ہے۔
یہ شہر جنوبی ہند میں ربڑ کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے بڑا دلکش
میں ربڑ کے باغات بہت سی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ کوٹائم میں چیریا پلی
کا ایک قدیم گرجا ہے۔ جو کہتے ہیں چھ سو برس پرانا ہے (کوٹائم
چھ میل اور جنوبی ہند کا سب سے پرانا گرجا ہے۔ اس کا نام
ویلنگنا۔ یہ گرجا پہلی صدی عیسوی کا ہے۔ اسی صدی میں بحیرہ روم
کے بہت سے شامی عیسائی جنوبی ہند میں آ کے آباد ہوئے جن کی اولاد
آج تک کوٹائم میں پائی جاتی ہے۔

اوائی اور کوٹائم کے درمیان سٹیٹ ایکسپریس بڑے خوبصورت
مقامات اور دلکش کہستانی علاقوں سے گذرتی ہے۔ موٹر کے کنارے
سارے چھوٹے چھوٹے ان گنت گاؤں نظر آتے ہیں۔ ان کے خوبصورت
مکانات چینگ کلیہ پتھروں سے تعمیر کئے گئے ہیں، اور ان پر ناریل کے
پتوں سے چھتے ہوئے جو گذشتہ شفقت دور سے بڑے بھلے معلوم
ہوتے ہیں۔ قریباً ہر گھر کے باہر کیرالا میں پیلے پیلے کیلے لٹکے ہوتے
ہیں، اور زمین میں کالی مرچ دھوپ میں سکھانے کے لئے رکھی
ہوتی ہے۔ کالی مرچ کی بیل یہاں کی خودرو نباتات میں سے ہے
اس کے علاوہ ٹیپیوکا کی گانٹھیں آلو کی طرح کاٹ کے کھانے کے لئے
جگہ جگہ دھوپ میں پڑی دکھائی دیتی ہیں، کہیں کہیں کوئی ایک کسان بانس
کی بہنگی میں چھاج بھر کے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو جا رہا
ہے۔ چند عیسائی عورتیں گرجا سے واپس آ رہی ہیں۔ کیرالا کی عورتوں کا
لباس بلا تفریق مذہب و ملت ایک سا ہی ہوتا ہے۔ ایک قمیض اور ایک
دھوتی جسے وہ مردوں کی طرح تہمندی کی طرح پہنتی ہیں، لیکن عیسائی عورتیں
امتیاز پیدا کرنے کے لئے اس دھوتی کو اس طرح باندھتی ہیں۔ کہ دھوتی
ایک پلو پشت پر کلغی کی طرح باہر جھلکتا رہتا ہے۔ اس کلغی کو نبور کہتے
ہیں، چھوٹی بچیاں سفید فراق پہنتی ہیں۔ اور راستے میں یہ منظر تو بڑا خوشگوار
تھا۔ کہ سڑک کے کنارے صبح سے شام تک ہزاروں بچے ملتے ہیں۔
اپنے بغل میں داب یا اسکول جا رہے ہیں۔ یا اسکول سے آ رہے

ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی علاقے میں یہ منظر ہم نے نہیں دیکھا۔ یہاں کی آبادی پچاس فی صدی کے قریب خواندہ ہے۔ اور ملیالم زبان میں بیس کے قریب روزنامے نکلتے ہیں۔ جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے گرجا، اسکول اور چائے کی دوکانیں بے شمار نظر آتی ہیں، راستہ کبھی پہاڑیوں کی تنگ گھاٹیوں سے گزرتا ہے اور کبھی نیچے کی میدانی وادیوں کو کاٹتا جاتا ہے۔ جن کے بیچ میں آہستہ خرام ندیاں بہتی ہیں۔ جن کے اوپر لکڑی کے پل ہیں۔ اور جن کے دونوں طرف دھان کے سرسبز اور شاداب کھیت۔ اپنی سمندر ہریالی سے آنکھوں کو تراوٹ بخشتے ہیں۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اس لئے بہت سی جگہوں پر دھان پیلا پڑ گیا تھا۔ اور کاٹا جارہا تھا۔ بہت سی جگہوں پر کسان ندی کے کنارے، نشیب پر بند باندھ کے لکڑی کے چکر سے پانی نکال رہے تھے، اور اس طرح پانی سے نئی زمین چھین کر اسے دھان کی کاشت کے قابل بنا رہے تھے۔ لکڑی کے چکر میں دو سے کر تیس بلیڈ لکڑی کے ہوتے ہیں، اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی مچان پر آدمی بیٹھ کے اپنے پاؤں سے لکڑی کے بلیڈوں

کو چلاتا ہے اور لکڑی کا چکر چلنے لگتا ہے۔ اور پانی ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں بہتا جاتا ہے۔ لکڑی کے چرخ کے علاوہ یہاں دھان کے کھیتوں میں آپ پانی کے لئے ٹیوکنوئیں بھی نظر آتے ہیں۔ جو دوسری کنوؤں کی طرح پانی کو ایک سطح سے دوسری سطح پر لے جاتے ہیں۔ ٹیو میں ایک یا ایک سے زیادہ بانس کے لمبے لمبے ڈنڈے ہوتے ہیں جن کے ایک سرے پہ بوجھ ہوتا ہے۔ جو کنوئیں سے باہر رہتا ہے اور دوسرے سرے پہ ڈول ہوتا ہے۔ جو کنوئیں میں سے پانی بھر کے لاتا ہے ٹیو کا کام کرنے والے آدمی بوجھ کے نیچے کھینچ لاتے ہیں۔ پھر چھوڑ دیتے ہیں، ڈول کنوئیں سے پانی بھر کے باہر کھیت میں پانی الٹ دیتا ہے۔ پھر بوجھ نیچے جھک جاتا ہے، اور ڈول کنوئیں کے اندر چلا جاتا ہے۔ چرخ اور ٹیو کنوئیں یہاں کے منظر کا خاص حصہ ہیں۔ اور پھر کہیں کہیں جہاں پانی سطح زمین سے بہت قریب ہوتا ہے۔ وہاں دو آدمی ڈول کو رسیوں کے بیچ میں باندھ کے جھولے کی طرح چلاتے ہیں ڈول میں پانی گر کر اور پانی بھر کر باہر نکلتا ہے۔ اور جھولے کی گردش میں پانی باہر کھیت میں پھینک کر نالی کے راستے کے ساتھ جو ہر میں چلا جاتا ہے۔ پانی کی فراوانی سے، اور موسم کے موسموں کی وجہ سے یہاں دھان سال میں دو بار ہوتا ہے۔

وادیوں میں دھان کی دو فصلیں اور گھاٹیوں پر ٹیو ٹیکا ہوتا ہے جسے یہاں لوگ مرچھینی کہتے ہیں۔ مرچھینی کا پودا آٹھ فٹ سے اوپر نکلتا

ہے۔ اس کی شاخوں پر آلو نما پھول لگتے ہیں۔ جن میں آلو ہی کی طرح نشاستہ ہوتا ہے۔ مرچینی کی کاشت قلمی ہوتی ہے۔ یعنی پودے کے نچلے تنے کو چھ چھ انچ کے حصوں میں کاٹ کے کھیتوں میں دبا دیا جاتا ہے۔ اور ان کے اوپر مٹی کے ڈھیر تیار کئے جاتے ہیں، اور ان میں کھاد بھی دی جاتی ہے اور پانی بھی کچھ عرصہ کے بعد یہ قلم زمین میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور مرچینی کی آنکھوں سے سبز سبز کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں، پہاڑی علاقوں میں جہاں چاول نہیں ہوتا۔ وہاں یہی مرچینی عام کسانوں کی غذا ہے۔ وہ اس کے قتلے کر کے اسے سکھا کے اور پھر آلو کی طرح ابال کر مچھلی کے ساتھ کھاتے ہیں، مرچینی اور مچھلی اچھی غذا ہے۔ کیونکہ مرچینی میں نشاستہ ہوتا ہے۔ اور مچھلی میں پروٹین لیکن کسان لوگ چونکہ بہت غریب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ مچھلی تو بازار میں بیچ دیتے ہیں اور خود صرف مرچینی کھاتے ہیں۔ جس سے ان کی خوراک غیر متوازی ہو جاتی ہے۔ خالی مرچینی کھا کھا کے ان کی آنکھوں میں زخم ہو جاتے ہیں اور وہ لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں کے کسانوں میں آنتوں کے زخم کی بیماری عام ہے

اس علاقے میں کیتھو نڈی کا پیڑ بہت دیکھنے میں آتا ہے۔ ندی کا کنارہ پہاڑ کی چوٹی پہ، پہاڑ کی گھاٹی پہ، گھاٹی کے نیچے نشیب میں جہاں

دیکھئے یہ درخت موجود ہے۔ جہاں دھان ہوتا ہے، وہاں یہ پیڑ اگتے ہیں۔ اور جہاں دھان نہیں ہوتا۔ وہاں بھی یہ پیڑ پایا جاتا ہے جہاں مرچینی کی فصل ہے۔ وہاں بھی یہ درخت موجود ہے۔ اور جہاں کچھ بھی نہیں ہے خالی پتھریلی چٹانیں ہیں، اور سوکھی گھاس ہے۔ وہاں بھی یہ پیڑ کھڑا ہے۔ اس درخت کو کوئی نہیں اگاتا۔ اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا۔ یہ پیڑ آپ ہی آپ جہاں اسے جگہ ہے اگتا چلا آتا ہے۔ لیکن یہ کیشو نٹ کا پیڑ ہے، کوئی کرو ایسا نہیں ہے کار ہے معرف نہیں ہوتا نہیں ہے، جناب یہ درخت ہندوستان میں سب سے زیادہ ڈالر کمانے والا ہے۔ اس کا چھوٹا سا تنا دیکھئے۔ اس کے بدنما بھورے خاکستری پھولوں پر بھی نہ جائیے۔ انہیں پھولوں کے جھڑ جانے کے بعد ان میں وہ پھل لگتے ہیں جسے مغرب اور خاص طور پر امریکہ کے لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں، یعنی کیشو نٹ (ٹراونکور میں کیشو نٹ انڈسٹری) انہیں درختوں کے سہارے زندہ ہے۔ اور لاکھوں ڈالر کماتی ہے یہیں سے کیشو نٹ صاف کرکے اور چن کے امریکہ بھیجے جاتے ہیں جہاں سے سونے کے ڈالر آتے ہیں۔ اور سامراج کی نئی غلامی آتی ہے جس کا نام یاروں نے ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی آزادی رکھا ہے کہتے ہیں امریکہ اور ہندوستان میں جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس پر دستخط اسی کیشو نٹ کے قلم سے کئے جائیں گے۔

اور ایک کیشو نٹ ٹری پر ہی کیا منحصر ہے، کیرالا کے جتنے درخت ہیں سب کے سب ڈالر کمانے والے ہیں، چائے، کافی، کیشو نٹ پیپر، دائن، اکس، امیکا، ایلم، ربر، لگتے جائیے، ہر درخت ڈالر کماتا ہے۔ بس ایک یہاں کیرالا کے سمندری ریت ڈالر کمانے سے رہ گئی ہے۔ سو اب یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ یہاں کی سرخ ریت میں یورینیم کی بہتات ہے۔ اس لئے یہ سرخ ریت یہاں سے بوروں میں بھر کر امریکہ بھیجی جا رہی ہے۔ اور وہاں سے سونے کے ڈالر آ رہے ہیں۔

اور میں لاری میں بیٹھا بیٹھا سوچتا ہوں کہ اتنے سارے ڈالر جو کیرالا کی دھرتی کماتی ہے۔ آخر جاتے کہاں ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ اتنے ڈالر کمانے کے بعد بھی آج تک کیرالا کے عوام بھوکے ہیں اتنے خوبصورت کھیتانوں کے مالک ہوتے ہوئے بھی اتنی تنگی

معدنیات اور نباتات کے وارث ہوتے ہوئے آج ان کے سر
پر ٹوپی تک نہیں ہے۔ ان کے پاؤں میں جوتا نہیں ہے۔ ان کے
پیٹ میں چاولوں کے دانے نہیں ہیں، پیپ کے گلتے ہوئے
ناسور ہیں۔ میں معلوم نہیں یہ ڈھیروں ڈالر کدھر چلے جاتے ہیں، معلوم
نہیں ۱۵ اگست کو جو آزادی ہندوستان میں آئی تھی اسے کونسا
ڈاکو اٹھا کے لے گیا۔ کیونکہ یہ آزادی کیرلا کے کسانوں کے پلے تو
پڑی نہیں۔ ہاں ٹراونکور کے بازاروں میں موٹریں بجلی کی طرح گھومتی
ہیں۔ اور کوٹائم میں باٹا کے خوشنما جوتے بھی بکتے ہیں۔ اور لوائی
میں لاریوں کے ٹھیکیدار زرتار دھوتیاں پہنتے ہیں۔ لیکن کیوں میں
ان ڈالر کمانے والے عوام کو ان موٹروں میں بیٹھے نہیں دیکھتا ہوں
کیوں میں چنامہ ناشیری کے کسانوں کو باٹا کے جوتے پہنے ہوئے نہیں
دیکھتا ہوں۔ کیوں میں یہ زرتار پگڑیاں اور دھوتیاں الپی کے ریشہ بننے
والے مزدوروں کے جسموں پر نہیں دیکھتا ہوں۔ اور یہی سوچتا ہوں
جن لوگوں نے عوام سے ان کی موٹریں، ان کے جوتے، ان کی زرتار
دھوتیاں چھین لیں شاید وہی کیرلا کے عوام سے ان کی محنت کے
سونے کے سکے اور ان کی آزادی بھی چھین کے لے گئے۔ اور ان کے
ننگے سروں پر ناریل کے چھپے کی ٹوپیاں رکھ گئے۔ ان کے پیٹ میں چاولوں کے
دانے کے بجائے آنتوں کے ناسور دے گئے، اور ان کے پاؤں
میں جوتے کے بجائے کیرلا کے زہریلے سانپوں کے ڈنک

چھوڑ گئے۔

اور میں سوچتا ہوں، بہت دور کی نہیں، بہت نزدیک کی، ان پہاڑیوں سے پرے شمالی ملیبار کے لوگ لڑ رہے ہیں، اور کیرلا کے جنوب میں اور مشرق میں اور شمال میں اور مغرب میں اور کیرلا کے بیچ میں چاروں طرف دھوکہ بازوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اور بہت جلد یہ بساط الٹ جائے گی۔ اور یہ ہیرا پھیری۔ یہ دلالی، یہ چور بازاری۔ یہ سیاسی شعبدہ بازی ختم ہو جائے گی۔ اور کیرلا کے لوگ موت کے دم توڑتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی دولت، اپنی محنت، اپنی زندگی چھین لیں گے۔ بہت جلد! ایسا میں سوچتا ہوں

لاری کے باہر منظر بہت دلفریب ہے۔ ناریل کے بلند بالا سپید مرمریں تنے اور ان کے اوپر پتوں کے سبز پنکھے پھیلے ہوئے ہوا میں جھولتے ہوئے قطار اندر قطار...... کسی نیلی جھیل کے کنارے، جہاں گہرا مخملیں سبزہ ہے۔ اور اولم کے پیڑ ہیں، اور پانی میں کیرم پوٹیسلا کے بنفشئی پھول ہیں اور عورتیں دھان کے کھیت میں گا رہی ہیں۔

اے فی ٹرچیڑ الو گلا مے تمبورا کک گک۔

اسے فی الحال اجنبیم دلر ہے۔
(زمانہ میری بدصورتی دیکھ کر منہ بناتا ہے)۔
(لیکن میرے محبوب جیسے چانول دیکھ کر انھیں چوم جاتا ہے)
ہزاروں برسوں سے لے کر آج تک دنیا نے اپنا مقام کیا یہ مخزن (
گیت نہیں ہے اور یہ ماؤں کے دلوں کو مست کر دیتا ہے، لیکن کوئی نسل
نے اسے محسوس ہوا کیونکہ احساس یہ بھی ذہن اور ذہن آزاد کر دیتا ہے پیدا
نہیں ہوتا۔ وہ تو طاقت سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے آج کیرالا
کے دھانوں کے کھیتوں سے اگ رہا گیت اگ رہا ہے۔ یہ گیت جو
کیشونڈی کے پیڑ کی طرح ہر جگہ اور ہر مقام پہ اگنے والا ہے۔ اور
تیری گود میں کے سنہری رنگوں سے بکھری ہے۔

ترا سیاہ روتو چہ ان انو ملا نو سے
ترا میٹھا پال نما ان گنا ان تیرہم پہ دے۔
(جن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ جلدی سے اکٹھے ہو جائیں)
(دیر کر دی تو بھوکے مر جاؤ گے!)

کیرالا کے لال دھان شہیدوں کی ماں! آج سے تیرے
گیتوں اور تیرے چانولوں کے دانوں کو تجھ سے کون نہیں چھین
سکے گا۔ شمال کی طرف وہ دیکھ آج تیرے بیٹے کھائی کے

افق پہ اکٹھے ہو رہے ہیں راہی!

ٹراونڈرم ہم لوگ رات کے آٹھ بجے پہنچے۔ لاری میں ساڑھے
نو گھنٹے کا سفر رہا۔ اس سفر میں میرے ہمراہ سری دھر اور مادھون
تھے۔ دونوں طالب علم تھے، اور سٹوڈنٹ فیڈریشن کے سرگرم
کارکن۔ سری دھر ٹراونڈرم میں پڑھتا تھا۔ اور مادھون کوئی لون میں
دونوں کو دیکھتے ہی پارٹی کی بھوک لگ گئی ہے۔ اور دونوں رستے بھر
میری کم گوئی پہ متعجب رہے۔ سری دھر بہت کم بات کرتا تھا
مادھون اس سے بھی کم بات کرتا تھا۔ مادھون کا قد چھوٹا تھا
سری دھر کا قد اس سے بھی چھوٹا تھا۔ مادھون کی آنکھوں میں ایک عجیب
بھولپن تھا۔ لیکن سری دھر کی آنکھوں میں شرارت اور شوخی نمایاں
تھی۔ اور وہ اکثر میری طرح ناک سکوڑ کر سوال سوال کرتا رہتا۔ اور
میرے لیے نتی ارشد تھوکنے پر طنزیہ انداز میں مسکراتا ہے۔
لاری میں ہم لوگ اکٹھے بیٹھے تھے۔ ہمارے سے آگے، اور

پیچھے کی سیٹوں پر دوسری طرح کے لوگ بیٹھے تھے، دوسری طرف کے لوگوں سے میری مراد ایسے افراد سے ہے جنھیں ہماری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی ہمارے سامنے ایک پادری بیٹھا تھا۔ جو اپنے همراہی کو جو غالباً میری طرح نو وارد تھا۔ مختلف جگہوں کے متعلق مذہبی معلومات بہم پہنچار ہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر دو اور صاحب تھے جو راستے بھر شگار اور عورتوں کی باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی جگہ کے متعلق تین مختلف رائیں لڑ جاتیں مثلاً ایک جگہ کے متعلق پادری دھر اشارہ کرکے مجھ سے کہتا ہے دیکھئے یہ سنگتا تیری ہے یہ بنیا بلرپڑ گو پالن اسی جگہ کا رہنے والا تھا۔ بڑا اچھا لا، لڑا کا جینگیجو کا مرید تھا مزدور اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ وہ یہیں کا رہنے والا تھا!

پادری اس عرصے میں کہتا، یہ سنگتا تیری ہے یہاں ہمارے بشپ نے نیا گرجا بنوایا ہے۔ پاپا تر ستے کی ایک بہت بڑی تعداد کو ہم نے یہاں عیسائی بنا لیا ہے ـــــ اور پیچھے کی سیٹ سے آواز آتی، یہ سنگتا تیری ہے۔ یہیں وہ لڑکی مار یا رہتی ہے جس کا میں نے تم سے ابھی ذکر کیا ہے۔ ہائے کیا ملائم لونڈیا تھی۔ ناریل کے ... دے کی طرح ملائم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد ان کی آواز دھیمے قہقہوں اور پھر سر گوشیوں میں تبدیل ہو جاتی۔ اور میں سوچنے لگتا کس طرح ایک ہی جگہ کے متعلق مختلف ... انداز سے سوچنے والے مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ اور گویا ہر بار اس

جگہ کی شخصیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا درحقیقت ایسا ہے کیا آج بھی شنگھائی کو اس لیے مشہور ہونا چاہیئے کہ وہ ایک طوائف ہے یا وہ ایک گہوارا ہے یا اس لیئے کہ وہ ایک شہید کی ماں ہے۔ سوال دراصل زاویہ نگاہ کا ہے۔ کچھ لوگ عوام کو بھیڑ بکریاں سمجھتے ہیں، یہ کہ اس جگہ کتنی عیسائی کچہریاں ہیں، کتنی ہند و کیٹریا ہیں۔ کچھ لوگ اپنا ہر شے کو اپنی تعیش پرستی کی عینک سے دیکھتے ہیں اس جگہ پر عیاشی کے کتنے اڈے ہیں، کچھ لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ اس جگہ پر انسان آگے بڑھ رہا ہے کہ نہیں یہیں سے انہیں ترقی پسندی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شنگھائی کی طوائف کی کہانی لکھنے حقیقت پسندی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن اسے ترقی پسند نہیں کہا جا سکے گا۔

اس چیز کا تجربہ مجھے آگے چل کر ٹراونڈرم میں بھی ہوا۔ جہاں میں ایک شب کے لیئے ایک پٹرول پمپ کے سامنے کی عالیشان عمارت دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے ٹھاٹھ طرز تعمیر کو سراہ رہا تھا یکایک میری دوست نے مجھ سے کہا۔ یہاں پہلی بار طالب علموں نے مسٹر سی پی راما سوامی آئر کی مطلق العنان حکومت کے خلاف جلسہ کیا تھا۔ اور پولیس کی گولیاں اور لاٹھیاں کھائی تھیں۔ تو یکایک جیسے مجھے معلوم ہوا کہ یہ پٹرول پمپ محض پٹرول بھرنے کا آلہ نہیں ہے یہ سامنے کی گلابی عمارت ایک دلکش طرز تعمیر نہیں ہے۔

بازار میں چلتے پھرتے خریدتے بیچتے لوگوں کا اجتماع نہیں۔ یہ
یک لمبا باہمی سلسلہ ہے۔ یہاں زندگی کی انقلابی قوتیں کام
رتی رہتی ہیں، جہاں لوگ آگے بڑھنے کے لئے لڑتے ہیں، مرتے ہیں
ور نئی قدروں کو پیدا کرتے ہیں۔ لمحہ جو میرے سامنے ہے یہ لمحہ
بلا ہوا نہیں ہے۔ اس کی جڑیں ماضی میں ہیں اور چہرہ مستقبل کی طرف
ہے۔ ترقی پسند ادیب اگر سامنے کی گاتھک عمارت کی اینٹیں
تا شروع کر دے تو وہ حساب دان تو ہو سکتا ہے، ترقی پسند
دیب نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ پٹرول پمپ سے پٹرول لیجاتی
والی موٹروں کے رنگ روپ پر لکھ لے اور اسے صرف اپنے
رب میں جگہ دے تو ہمیں اس کی حیرت انگیز یادداشت اور رنگ
میزی کا قائل تو ضرور ہونا پڑے گا۔ لیکن اس کی سماجی بے بصیرتی کا ماتم
بھی کرنا پڑے گا۔ ادب پوری سچائی چاہتا ہے۔ وہ آدھی سچائی، ایک
تھائی سچائی، ایک جامد سچائی کا قائل نہیں، وہ ایسی سچائی چاہتا ہے
ہر شے کو الٹ پلٹ کر مختلف گوشوں سے دیکھتی ہے۔ اس کی لمبائی
چوڑائی گہرائی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے حال میں اس کے ماضی کی جڑیں
ڈھونڈتی ہے اور اس کے مستقبل کا چہرہ تلاش کرتی ہے۔ کیونکہ ایسی سچائی ہی
بڑی سچائی ہے۔ جو زندگی کی عکاسی تو کرتی ہے لیکن اس کی رہبری
نہیں کر سکتی۔ ٹراونڈرم اور پھر کوئی لون اور دہلی کے شہروں میں
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے چپے چپے پر انسانی ترقی

کی جدوجہد کے نشان ہیں۔ جیسے یہ نشان آگے بڑھتے جا رہے ہیں جیسے ان شہروں کو اپنے سامنے ہر لحظہ بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں وہ سچائی جو آگے بڑھ جاتی ہے، اور انسان کی تقدیر بدل دیتی ہے۔ وہ ادیب ادیب نہیں رہتا جو اس سچائی کے لئے نہیں لڑ سکتا اگر کارواں ہو کے رہ جاتا ہے۔

دوسرے دن میری پہلی تقریر یونیورسٹی کالج میں تھی۔ یہ کالج کوئی ایک سو برس پرانا ہے۔ یہاں کے لڑکے سیاسی اعتبار سے پختہ کار اور لڑاکے سمجھے جاتے ہیں۔ ملکی تحریکوں میں اس کالج کے نوجوانوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ بلکہ کبھی بار رہنمائی بھی کی ہے۔ سرتاپی راماسوامی ائر کے فسطائی دور میں ٹراونکور میں سب سے پہلے اس کالج کے طالب علموں نے ہڑتال کی تھی، اور عوامی جدوجہد کی جب میں اس وقت کانگریس بھی شریک تھی۔ رہنمائی کی تھی۔ اس کالج میں کوئی دو ہزار کے قریب طالب علم ہوں گے، ان میں سے آدھے کے قریب اس جلسے میں موجود تھے تقریر کے بعد لڑکوں نے بڑے دلچسپ سوالات کیے:

مثلاً آپ مارکس اور لینن کی تحریروں کو ادب کا درجہ دیتے ہیں کہ نہیں؟

جنوبی ہند کے لوگوں پہ ہندی زبان جو سرکاری زبان بنا کے ٹھونسی جا رہی ہے۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ادب میں کس چیز کو اہمیت حاصل ہے ہیئت کو یا مواد کو؟

ٹالسٹائے میں جو مذہبی عناصر پایا جاتا ہے۔ اسے ہم کہاں تک
عاف کر سکتے ہیں؟ ـــــ ان سوالات سے معلوم ہوتا تھا کہ طالب علم
س قدر باشعور طریقے پر نئے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ترقی پسند
دب سے کس قدر گہرا شغف رکھتے ہیں۔

صدر پروفیسر گپتا ناٹر تھے۔ انھیں ترقی پسند ادب سے
ڑی دلچسپی ہے۔ یہ خود بھی ملیالم زبان کے ایک اچھے تے ڈرامہ
گار اور اداکار سمجھے جاتے ہیں۔ بڑی سلجھی ہوئی شگفتہ گفتگو کرتے ہیں
ور ان کے انداز بیان اور ان کی شخصیت میں ایک خاص دلکشی اور
ذبیت پائی جاتی ہے۔

یونی ورسٹی کالج کی تقریر کے فوراً بعد مجھے ٹاؤن ہال جانا تھا۔
یہاں مہاتما گاندھی کالج کے طلباء نے ٹاؤن ہال میں ایک بڑی میٹنگ
انتظام کیا تھا۔ ٹاؤن ہال یہاں سے بہت دور نہیں تھا۔ اس
لئے ہم لوگ یہاں سے پیدل ہی چل پڑے۔ میرے ساتھ گپتا ناٹر
تھے، اور دوسرے ساتھی پھولوں کی کیاریوں سے گزرتے ہوئے
گھاس کے ننھے ننھے قطعوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے ہم لوگ کالج
کے وسیع میدان میں پہنچے، جہاں آم کا ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔

ناٹر نے مجھ سے کہا، آپ نے یہ کام کا درخت دیکھا؟

ہاں

کیسا ہے؟

میں اس کے سوال پر حیران ہوا۔ پیڑ کو اچھی طرح سے دیکھ کر میں
نے کہا اچھا ہے لیکن جیسے آم کے دوسرے پیڑ ہو سکتے ہیں۔ ویسا ہی
ہے یہ بھی؟

نائڈو نے مسکرا کے کہا ایک واقعہ اس آم کے پیڑ کے لئے یونیورسٹی
کالج کے لڑکوں نے ہڑتال کر دی تھی۔

وہ کیوں ۔۔۔ کیسے؟ میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی؟

نائڈو نے کہا۔ کالج کے منتظم اس پیڑ کو کٹوا ڈالنا چاہتے تھے۔
وہ کہتے تھے اس پیڑ سے کیمپس کی خوبصورتی میں فرق پڑتا ہے۔ اور لڑکے
کہتے تھے۔ ہم اس پیڑ کو کٹنے نہیں دیں گے۔ کتنے برسوں سے یہ پیڑ یہاں کھڑا
ہے۔ کتنی ہی بار سینکڑوں طالب علموں نے تپتی ہوئی دھوپ میں اس کے
خوشگوار سائے تلے آرام کیا ہے۔ ہم اس پیڑ کو ہرگز کٹنے نہیں
دیں گے۔

نائڈو چپ ہو گیا۔

میں نے پوچھا ۔۔۔ پھر؟

نائڈو نے کہا ۔۔۔ تم درخت دیکھتے ہو، لڑکوں کی کامیاب
ہڑتال کا نتیجہ ہے یہ درخت آج تک یہاں کھڑا ہے۔

آم کا درخت اپنا گھنا گھنا سایہ پھیلائے ہمارے سامنے
کھڑا تھا۔ آم کا پرانا معمر چوڑے سے چکنے تنے والا درخت اپنے خوشنما
پتیوں کے شاداب سرسبز لئے اس وقت کس قدر حسین نظر آ رہا تھا

کمرے کے ستونوں سے ٹیک لگا سکے۔ دو لمبے کتاب پڑھ رہے تھے
ان کے سینے پر کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کے نام سینٹی مینٹل کی طرح
چمک رہے تھے۔ ایک جگہ پر دل کھدا ہوا تھا جس میں ایک تیر دیا ان تھا
ایک جگہ پر لکھا تھا "میں وعدہ کرتی ہوں میں آؤں گی" ایک جگہ پر صرف
"تمہارا" ایک جگہ پر دو ہاتھ مصافحہ کر رہے تھے۔ نوجوانی کی کتنی ہی تلوار
باتیں۔ پیمان وفا کے کتنے ہی حسین لمحے اور واقعات کندہ کئے ہوئے ہیں۔ دلکش
رقعے محبت کے کتنے ہی تاج محل۔ اس درخت کے تنے پر لکھے ہوتے تھے میں
نے سوچا کس قدر جیالے ہیں ہمارے ترقی پسند طالب علم جو
صرف حال اور مستقبل کے لئے نہیں، وہ ماضی کے لئے بھی لڑ سکتے ہیں
جو کی شاندار اور خوبصورت روایات کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ جو صرف
[illegible] یونٹ کے مزدوروں کے لئے ہی نہیں لڑتے وہ ایک [illegible]
کے لئے بھی لڑ سکتے ہیں۔ صرف وہی لوگ جو زندگی سے پیار کرتے ہیں۔ جو
عوام سے پیار کرتے ہیں۔ جو ان کی روزمرہ کی لڑائیوں میں شامل ہوتے ہیں
وہی لوگ خوبصورتی کے لئے بھی لڑ سکتے ہیں۔ خوبصورتی اور فن اور
روایات کی دہائی دے سکتے ہیں اسے کو عزور [illegible] ہم میں سے ہر ایک کو اس آم
کے پیڑ کو دیکھنا چاہئے۔ جیسے پرانی خوبصورتی کے محافظوں اور نئی خوبصورتی
کے خالقوں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ اس خوبصورتی کا تحفظ و تعین
[illegible] کیسے کریں گے جو ایک عورت کے جسم پر پاکیزہ نظروں
سے نہیں دیکھ سکتے، انہیں یا نیلر کی طرح محبوبہ کے ہونٹوں سے بھی

لافتوں کی بُو آتی ہے۔ اور جو عوام کی لڑائیوں میں حصہ لیتے وہ اسے ترقی پسندوں کو جیب کترے کہتے پھرتے ہیں۔ عوام کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی جیب پر ڈاکہ ڈالنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے آزادی کے نام پر ان کی جیب کاٹی ہے۔ اور خوبصورتی کا نام لے کے آم کا پیڑ کاٹے ہیں۔

ٹاون ہال میں کوئی ایک ہزار کے قریب آدمی ہوں گے۔ او اتنے ہی اور آدمی باہر کھڑے ہوں گے۔ اس تقریر کے بعد میں اپنے مسافر خانہ میں چلا گیا۔ جہاں بہت رات گئے تک طالب علموں اور پریس کے نمائندوں سے ترقی پسند ادب پر بحث ہوتی رہی جو دوسرے دن نمایاں طور پر اخبار وں میں چھاپی گئی۔ اس پورے دورے کے دوران میں پریس نے ہماری انجمن کے جلسوں کی کارروائیوں اور تقریروں اور بحثوں اور پریس کانفرنس کی گفتگو کو ہمیشہ نمایاں طور پر چھاپا۔ اور انجمن کے پیغام کو اچھی طرح نشر کیا۔ اس کا سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ کیرالا کے جرنلسٹوں کی ایک

کثیر تعداد جو مختلف اخباروں میں کام کرتی ہے۔ دلی طور پر ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہے۔ اس کا اندازہ خود ان کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ شمالی ہند کے کئی ایک جرنلسٹوں کی طرح اپنے آپ کو مزدوروں سے ایک برتر طبقہ نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ خود کو مزدور سمجھ کر انھوں نے کام کرنے والے ساتھیوں کی ایک انجمن بنائی ہے۔ جسے یہ لوگ ٹریڈ یونین کے نام سے چلاتے ہیں۔ پریس کے سرمایہ پرست مالکوں سے اپنی مانگوں کے لئے لڑتے بھی رہتے ہیں۔ اسلئے بھی ان لوگوں کو ہماری صعوبتوں کا اندازہ اور ہمارے نصب العین سے ہمدردی ہے۔

ترِاونڈرم سے جنوب کی آخری حد پر راس کماری ہے جسے لوگ
عام طور پر کنیا کماری کہتے ہیں۔ یہاں جانے کے لئے تھامس عرد
راجن کی گاڑی مل گئی۔ تھامس کو اس کے دوست پیار سے راجن کہہ کر
پکارتے ہیں۔ راجن ایک چھوٹے سے پریس کا مالک ہے۔ کچھ عرصہ پہلے
وہ ایک ہفت روزہ اخبار بھی شائع کرتا تھا۔ یہ اخبار ۲۰ سال پرانا
اس اخبار نے جنوبی ہند کی سیاست کے سارے رنگ دیکھے
سرکار پرستی سے اعتدال پسندی اور اعتدال پسندی سے قوم پرستی
اور پھر قوم پرستی سے اشتراکیت۔ اشتراکیت کی طرف جھکتے ہی حکومت
نے اسے بند کر دیا۔ راجن کو اپنے پرچے کے بند ہونے کا بہت افسوس
تھا۔ ۲۰ برس پرانا تھا، وہ پرچہ جسے اس کے بزرگوں نے اپنے خون
سے سینچا تھا۔ راجن نے گاڑی گھما کے ترِاونڈرم کے مضافات کو

سامنے سے گزرتے ہوئے کہا، گھبراؤ نہیں، وہ پھر نکلے گا۔ میں نے کہا
اس نام سے نہیں کسی دوسرے نام سے نکلے گا کیونکہ اخبار کبھی
نہیں مرتا ہے۔ اس نے کہا تم نے ہی نام ہوتے ہیں، جیسے عام لوگوں
کے نام ہوتے ہیں، وہ نام بدل بدل کے سامنے آتا رہتا ہے۔ اور
بازاروں اور گلیوں اور کوچوں میں اپنی صدا سناتا رہتا ہے۔ اور
جب زمین کے اوپر جھوٹے دشمن اپنی طاقت سے اس کے لئے
قانون کے سارے دروازے بند کر دیتے ہیں تو یہ اخبار زمین کے
نیچے چلا جاتا ہے اور پھر وہاں سے ایک ہری کونپل کی طرح پھوٹتا ہے
اور دوسرے روز اس کے صفحے عوام کے دلوں میں پھیلتے جاتے ہیں
اور اس کی صدا گلیوں اور کوچوں اور بازاروں میں پھر سے سنائی دینے
لگتی ہے۔ اور لوگ سرگوشیوں میں اس کا چرچا کرتے ہیں۔ اور طالب علم
اور مزدور اور کسان اپنے وطن کی بھلائی چاہنے والے محب الوطن
اسے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے جاتے ہیں
جیسے شمع سے شمع جگمگا اٹھتی ہے۔ جیسے تبسم سے تبسم چمک اٹھتا ہے
اسی طرح سے پھر یہ اخبار عوام کے دلوں کو انقلاب کی ضو سے
جگمگاتا ہوا چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ اور پھر نئے ولولوں سے
گھرے ہوئے بند کمروں کے اندر ظالم چونک اٹھتے ہیں، یہ اخبار
پھر زندہ ہو گیا، اسے ہم نے تو ابھی منسوخ کر دیا تھا۔ کل ہی قتل کیا تھا۔
اور پرسوں اس کے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور اس سے پہلے اس کے

ایک اور بھائی کو مارا تھا۔ اور اس سے پہلے لیکن آج یہ پھر زندہ ہے
اور اخبار کے الفاظ اِن کی آنکھوں کے سامنے ایک فاتحانہ مسرت
سے رقص کرتے ہوئے کہتے ہیں ہم نہیں مر سکتے۔ کیونکہ عوام کے الفاظ
ہیں، اور کوئی ہمیں خرید نہیں سکتا ہے۔ اور بیچ نہیں سکتا۔ ہمارا
کوئی ہمارے گلے میں پھانسی کی رسی نہیں لٹکا سکتا ہے کیونکہ ہم
تو عوام کی آواز ہیں، ان کے دل اور ان کی روح کی گونج ہیں، ایک آدمی
مارا جا سکتا ہے۔ دو آدمی مارے جا سکتے ہیں، دو ہزار آدمی مارے جا
سکتے ہیں، دو لاکھ آدمی مارے جا سکتے ہیں، لیکن سارے کے سارے
عوام قتل نہیں کو قتل نہیں کئے جا سکتے .... اس لئے آج
پھر ہم تمہارے سامنے ناچ رہے ہیں، کل تم نے اپنی دانست میں
ہمیں قتل کر دیا تھا۔ لیکن ہم مرے نہیں تھے، ہم تو ایک بیج
کی طرح دھرتی کے سینے میں چھپ گئے تھے۔ وہاں ہمیں گرمی ملی۔
کسی کا لہو ملا، کسی کی چاہت ملی، کسی نے اپنا سانس دیا۔ اور آج
ہم پھر زندہ ہو کر دھرتی سے باہر نکل آئے ہیں، اور تمہارے
سر پر تاریخ کی تلوار بن کر ناچ رہے ہیں۔ ہم سے ڈرتے ہو ظالمو...
..... تمہارا ڈر بے وجہ نہیں ہے، کیونکہ ظالم ختم ہو جاتے ہیں، ظلم
مٹ جاتا ہے۔ اور ظلم کے الفاظ بھی مر جاتے ہیں، لیکن عوام
زندہ رہتے ہیں، اور ان کے الفاظ بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور ان کا
ادب بھی ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

راجن کی گاڑی کنیا کماری کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور راجن کہہ رہا تھا۔ اخبار کے بند ہونے کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میرا بڑا بھائی مجھ سے چھین لیا گیا ہو، اب صرف میں رہ گیا ہوں، اور میری بیوی ہے۔ اور میرا چھوٹا سا بچہ..... گھر میں اخبار نہیں ہے۔ تو گھر سونا سونا معلوم ہوتا ہے۔ سٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر گوپی نے کہا، اخبار بند ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد راجن کے گھر کی تلاشی ہوئی تھی۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

ان کا خیال تھا۔ شاید میں اپنے گھر میں کمیونسٹوں کو چھپا رکھا ہے راجن نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہنس مکھ گوپی نے کہا۔ ہاں اگر خانہ تلاشی ہی لی جاتی ہے تو بھی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن انھوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارنے کے بعد ہر چیز توڑ دی۔

راجن نے کہا۔ پولیس پاتی کے گھڑوں اور مٹی کی ہانڈیوں میں جھانک جھانک دیکھ رہی تھی کہیں ان میں کوئی کمیونسٹ تو چھپا ہوا نہیں

ہے پھر انھوں نے کچن کے سارے برتنوں کو توڑ دیا۔ کتابیں پھاڑ دیں۔ ریڈیو، پلنگ، کرسی، میز، بچے کا جھولا ہر چیز توڑ ڈالی گئی،

بچے کا جھولا بھی ـــــ ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں۔ راجن نے کہا، انھیں شبہ تھا کہیں جھولے میں کوئی کمیونسٹ موجود نہ ہو۔ پھر قدرے توقف کے بعد راجن بولا، اور وہ غلطی پر بھی نہیں تھے، جھولے میں میرا بچہ تھا۔ . . . . . . نیلیس نے راجن کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ تمہاری کار تو سلامت ہے، وہ بھی اس لئے میری کار دوسروں کے کام آتی رہتی ہے، راجن نے جواب میں کہا، اور اکثر ایسے آدمیوں کے کام آتی ہے۔ جن کی آمد و رفت کے متعلق پولیس کو جاننے کی خواہش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اس لئے میری کار میرے پاس موجود ہے۔ اور مجھے اس کے لئے جیسے چاہوں، زیادہ پیٹرول بھی مل جاتا ہے۔

گوپی نے کہا ـــــ ہاں پولیس کا کام ہلکا ہو جاتا ہے نا۔

اب ہم ٹراونڈرم سے چھ میل آگے قریب آ گئے نکل آئے تھے راجن نے اشارہ کر کے کہا شہر کی بس سروس یہاں تک آتی ہے۔ حالانکہ شہر یہاں سے چھ میل دور رہ گیا ہے۔

وہ کیوں میں نے پوچھا۔

یہاں ایک کانگریسی ایم۔ ایل۔ اے رہتا ہے، اسلئے اسے لینے کے لئے میونسپل حدود سے چھ میل باہر تک بس سروس چلتی ہے۔

کوربین نے کہا۔ وہ عمارت تم دیکھتے ہو۔ وہاں کیا ہے وہ؟

یہ بوچڑ خانہ ہے۔ یہاں گاندھی جی کی بکریاں قتل ہوتی ہیں۔ تمھیں معلوم ہے، اس بوچڑ خانہ کا ٹھیکہ کس نے لیا تھا؟ ——— ایک کٹر کانگریسی نے ...... عدم تشدد کی جے ......

میں نے کہا۔ عدم تشدد کا فلسفہ بکریوں اور انسانوں کے لئے نہیں ہے وہ صرف دیوتاؤں اور چور بازار والوں کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔

گوپی نے کہا۔ اور یہ جگہ جو تم دیکھتے ہو اس کا نام ہے چھ کیلا۔

چھ کیلا کیوں ——— میں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ کسی زمانے میں یہاں کیلوں کے چھ درخت ہوں گے۔

میں نے کہا۔ مجھے بمبئی میں اپنا گھر یاد آرہا ہے، اس جگہ ایسا عجیب نام ہے۔ چار بنگلہ، کبھی وہاں بھی صرف چار بنگلے ہوں گے

مگر صاحب آپ کے چار بنگلے میں کیا ایسا تالاب موجود ہے جہاں مینڈک نہ رہ سکتے ہوں۔ راجن نے پوچھا۔

نہیں!

تو ذرا اس تالاب کو دیکھنے جائیے۔ اس تالاب میں ایک بھی مینڈک نہیں ہے، پروہت لوگ کہتے ہیں کہ راجہ اندر نے

مینڈک کو سراپ دے دیا تھا، جب وہ گوتم رشی کی غیر حاضری میں اس
کی بیوی اہلیہ بانی سے اختلاط کر کے جا رہا تھا۔ اس وقت یہ مینڈک
بہت شور مچا رہے تھے۔ اندر دیوتا نے غصے میں آکے اس
تالاب کے سارے مینڈکوں کو سراپ دے دیا اور جب سے
یہاں ایک مینڈک بھی اس تالاب میں نہیں رہتا

میں حیرت سے راجن کو منہ کو تکتا رہ گیا۔

راجن مسکرا کے بولا۔ یہ تو ہوئی دیو مالا۔ اور اب حقیقت صرف یہ
ہے کہ اس تالاب میں گندھک کی ملاوٹ ہے۔ اس وجہ سے یہاں
مینڈک نہیں ہوتے سمجھے جاتے ہیں۔ . . . . . . یہ تالاب کے پانی
کی زرد رنگت . . . . ہے ہی . . . .

تالاب بہت پیچھے رہ گیا تھا، راجن کہہ رہا تھا، اسی گندھک
کی وجہ سے اس علاقہ کے لوگوں میں جلد کی بیماریاں بہت کم ہوتی
ہیں، اور وہ بالعموم تندرست اور صحت مند پائے جاتے ہیں
اور دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ عمر کو بھی پہنچتے ہیں۔

اب گاڑی ایک چھوٹے سے قصبے کے بیچ میں گذر رہی تھی، راجن
نے مجھے بتایا کہ یہاں ناریل کے ریشے بننے کے دو بڑے مرکز ہیں۔
مگر آج کل یہاں کوئی کام نہیں ہو رہا اور مزدور لوگ بے کار
بیٹھے ہیں۔

کیوں؟

بس اتنی سی بات ہے کہ ناریل کے ریشے پر بازار میں چلے گئے
ہیں اور مرکز بند ہو گئے۔ مزدور بیکار بیٹھے ہیں۔

رستے میں جگہ جگہ گرجے اور مسجدیں نظر آتی ہیں۔ جب میں نے
ان کی فراوانی کی طرف اشارہ کیا۔ تو راجن نے کہا، یہ بات عجیب سی ہے
یہاں کے لوگ امیر ہیں، اس علاقے کے لوگ کیرالا اور تامل ناڈو کے
دوسرے علاقوں کی طرح بدستور غریب ہیں، لیکن مصیبت یہ ہے
بیچارے عوام اس قدر معصوم اور خوش فہم واقع ہوئے ہیں کہ جب
اس مذہبی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر وہ اس جہاں میں غریب ہیں
کیا۔ اگلے جہاں میں انہیں سب کچھ مل جائے گا، اور مذہبی ادارے
مختلف طریق سے اس خیال کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں، اس لئے
آپ دیکھیں گے کہ لوگ غریب ہیں، گرجاؤں کے پادری اور مسجدوں
اور مزاروں کے متولی بیحد امیر ہیں۔

پادریوں اور ملاؤں میں لڑائی بھی ہوتی ہے؟ میں نے پوچھا
راجن نے مجھے بتایا کہ یہ لڑائی اس علاقہ کی خصوصیت ہے۔ مسلمان
ادھر بہت کم ہیں۔ مگر بڑے لڑاکے واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ
زیادہ تر ماہی گیر ہیں۔ ان میں آپس میں چلتی رہتی ہے، لڑائیاں ہوتی
سر پھٹول اور خون خرابہ اب مذہبی فریضے میں شامل ہو چکا ہے کچھ
تنازعے عدالت تک پہنچائے جاتے ہیں، اور یہ سارا انتظام
و اہتمام ایک طرف چرچ اور دوسری طرف متولی کی طرف سے

ہوتا ہے اور وہی لوگ اس نیک کام کے لیے پیسے لگاتے ہیں جن کا صلہ انھیں اس طرح ملتا ہے۔ کہ ہر سال کوئی نہ کوئی نیا گرجا کھڑا ہو جاتا ہے۔ یا کوئی نیا مزار دریافت ہو جاتا ہے۔ اور پھر نیا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔

بشپ آنت کوٹا ضونی بہار کے امیر ترین آدمیوں میں سے ہیں۔ گوپی نے مجھے بتایا۔

راستے میں چائے پینے کے لیے گاڑی ایک مقام پر روک دی گاڑی کے رکتے ہی بہت سی عورتوں نے اسے گھیر لیا۔ ان عورتوں نے بڑے شوخ رنگ کی ساڑھیاں پہن رکھی تھیں جن سے ان کا سیاہ رنگ خوب کھلتا تھا۔ کانوں میں عجیب و غریب شکل کے بڑے بڑے آویزے تھے۔ جیسے سانپ کنڈلی مار کے بیٹھا ہو۔ گردن چہرہ بازو یا ٹرنک کی طرح جگہ جگہ سے گدے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پان بانمرا کے ریشوں سے بنی ہوئی صندوقچیاں تھیں اور مٹی کے بے اور مونڈھے تھے۔ چائے کے بجائے ہم لوگوں نے پان بانمرا کا ٹھنڈا رس پیا۔ سامنے دکان پر ایک کلینڈر لگا تھا جس کے سر ورق پر پوپ اور نہرو کی تصویریں تھیں۔

پوپ اور نہرو سے۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ بھی عجیب کلینڈر ہے۔

فلپس نے مسکرا کے کہا۔ اس میں عجیب بات کیا ہے۔ دونوں

یونسٹوں کے مخالف ہیں اور یہی مخالفت ان دونوں کو اس کیلنڈر
اکٹھا کرتی ہے۔

پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

فلپس کہہ رہا تھا جس آدمی نے یہ کیلنڈر چھاپا ہے۔ اس
سیاسی بصیرت کی میں داد دیتا ہوں ۔۔۔۔ یہ کیلنڈر آپ کو جگہ
یہاں لٹکا ہوا ملے گا۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اس غیر جانبداری
زمانے میں یہاں بھی پوپ کا وہ فرمان آپہنچا ہے۔ اس پر عمل بھی
رہا ہے۔ وہ فرمان جس میں عیسائیوں کو اشتراکیوں سے عملی
تعاون کی تلقین کی گئی ہے۔ اور انھیں اپنے حلقے سے ختم کر
کو کہا گیا ہے۔ یہ بھی کوئی دن کی بات ہے پھر شاید چرچ ہمارے
کو بپتسمہ نہیں دے گا۔ ہماری شادیاں منظور نہیں کرے گا۔ ہمیں
میں جگہ نہیں دے گا۔ ہم لوگ آگے چل کر کیا کرنے والے ہیں۔ اسے تو
بالعموم میں سانے کے گی۔ لیکن چرچ کے ذمہ دار افراد آج ہمارے ساتھ
اکرتے ہیں۔ یہ سب پر ظاہر ہے۔

راجن نے مجھ سے کہا۔ یہ صندوقچی لے جائیے یہاں کی خاص
سوغات ہے۔

میں نے سر ہلا دیا۔

اچھا تو یہ ڈبہ۔

نہیں۔

یہ پنکھا۔

نہیں۔

یہ پال ماٹرا کی لکڑی کا بنا ہوا کتاب دان ۔۔

تو کیا لو گے؟

مجھے یہ کیلنڈر دے دو۔ جس پہ پوپ اور نہرو کی تصویریں ہیں۔

یہ تو ر) سے بڑھ کے نیت کر رہا ہے۔ تم جانتے ہو اس وقت میرے جی میں کیا ہے۔ میں ایک ایسا آئینہ چاہتا ہوں جس میں چیزیں الٹی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی الٹی کہ جب میں مستقبل دیکھنا چاہتا ہوں تو میں ماضی کو دیکھوں۔ اگر ایک آئینہ ایسا میرے پاس ہوتا تو میں وہ آئینہ لے کر اپنی قومی تحریک کے سارے شہیدوں اور دیش بھگتوں کو بلاؤں اور لوگوں کو بھی جنہوں نے پارلیمنٹ میں لڑائی لڑی۔

ان لوگوں کو بھی جنہوں نے کھیتوں میں لڑائی لڑی۔ ان لوگوں کو بھی جنہوں نے جلیانوالہ باغ میں گولیاں کھائیں۔ اور ان لوگوں کو بھی جنہیں سن بیالیس میں پھانسی دی گئی۔ میں چاہتا ہوں کہ میں دادا بھائی نارو جی سے بھگت سنگھ تک سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دوں۔ اور پھر ایک ایک کو یہ کیلنڈر دکھا کے پوچھوں۔

کیا تم نے آزادی کی لڑائی اس کلینڈر کے لئے لڑی تھی؟

پوپ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پوپ اور
پہونچی نہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

MANSOOR BROTHERS
No. ....
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

انھوں نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا، اس کلینڈر
یکھ کے واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ سن بیالیس میں ہندوستان
جو کچھ ہوا۔ وہ انقلاب نہیں تھا۔ اسقاط انقلاب تھا۔ راجن نے
ی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا، ماضی کو دیکھنا چاہتے ہو تو اس
یٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں سے قریب ہی شاہی خاندان
ملات ہیں۔ آؤ تمہیں وہ دکھلا لائیں۔ اور قریب ہی ہمارے
کمانڈر کی قبر ہے۔ جس نے ہماری ریاست کی توسیع کی کیپٹن ڈل ناٹے

ڈچ کمانڈر ـــــ؟

ہاں ـــ وہ ایک ڈچ بحری بیڑے میں کپتان تھا۔ اور ہمارے
ما پر حملہ آور ہوا۔ لیکن ہمارے کمانڈر نے اسے شکست دی۔
اس وقت کے مہاراجہ نے بڑی دور اندیشی سے کام لے کر اسے
ج میں ملازم رکھ لیا۔ اور اسے سیناپتی بنا دیا۔ اس کمانڈر نے بہت
لیریں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں فتح کیں اور انھیں ہماری ریاست
م کر دیا۔

ایک پہاڑی ٹیلے کے دامن میں ایک کھلے گرجا کے اندر جس کی چھت نہیں تھی۔ ڈل نائے کی قبر تھی۔ نہایت سیدھی سادھی قبر تھی مجھے کھلے گرجا بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چھت آسمان ہے۔ اس قبر میں اپنی سادگی کے باوجود ایک خاص رعب اور دبدبہ تھا۔ گرجا کے اندر اور گرجا کے باہر گھاس کے خوشنما قطعے تھے اور املی کے بڑے بڑے درخت پر سکون انداز میں کچی سڑک پر سایہ ڈالے کھڑے ہیں۔ قبر سے واپس آ کے ہم لوگ اس کچی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ اور میں اس زمانے کی باتیں سوچنے لگا۔ جب فرنچ بیڑے اور فرانسیسی بیڑے اور پرتگالی اور انگریزی بیڑے ہندوستان کے ساحلوں پر، اپنے قدم جما رہے تھے۔ جب صنعتی انقلاب کے بعد یورپ سامنت شاہی زمانے کے مغلئی ہندوستان پر غالب آ رہا مغلئی ہندوستان نے یورپ کے صنعتی انقلاب کا فائدہ اٹھایا۔ او خود مٹ گیا۔ اور آج کا ہندوستان پھر اشتراکی انقلاب سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ یہ ہندوستان بھی مٹ جائے گا۔ کیونکہ بہتر ہمیشہ کمتر شے پر غالب آجاتی ہے۔

ناگ پھنی کی اونچی اونچی جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے، لا یکایک رک گیا۔ اور ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

جانتے ہو یہ کونسا درخت ہے ؟

کونسا ہے ؟

یہ صندل کا درخت ہے۔

لاحول ولا قوت — بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ یہ سڑ لسا
کا ٹھیا۔ مخنی سے سیاہ کھردرے تنے والا صندل کا درخت ہے؟
رنگ یا ریک مرجھائی ہوئی پتیاں، اور زرد زرد بھوٹے سے پژمردہ پھول
سے یہ صندل کا درخت ہے۔ اور یہ او کھڑا بدصورت مریخ تنا
ہے۔ اس کا .... صندلی بانہیں؟ ...... لاحول ولا.....
ندلی بانہیں کیسا فریب دیا ہے۔ اس درخت نے اردو کے شاعروں
۔ اگر یہ لوگ کبھی اپنی زندگی میں اس درخت کو ایک بار دیکھ لیتے
تو کبھی صندلی بانہوں کا نام نہ لیتے کیا صندلی بانہیں ایسی ہی کھردری اور
ہیبت ہوتی ہوگی؟ ہماری شاعری حقیقت سے کس قدر دور رہی ہے
ں کا احساس مجھے صندل کے درخت کو دیکھ ہوا۔ یعنی کس قدر بدصورت
گنج قسم کا درخت ہے کہ دیکھ کر جی جلتا ہے۔ میں نے راجن سے
جنوبی ہند میں آ کے دو ناموں کا طلسم بڑی بری طرح ٹوٹا ہے۔ ایک
ڑکا دوسرے صندل کا خاص لانکہ دونوں نام بڑے خوبصورت اور خوشبودار
مانتے ہیں۔

لاج ہنسنے لگا۔ بولا، خیر صندل تو بڑی کارآمد چیز ہے؟ یا
کدھر ہے وہ صندل؟ میرا سے پوچھا۔

اس درخت کے تنے کی چھال الگ کر دیتے ہیں۔ اس میں
ل نہیں ہوتا۔ پھر اس کے تنے کے اوپر کی لکڑی کو بھی الگ کر دیتے

ہیں، پھر تنے کے اندر جو لکڑی کا حلقہ ہوتا ہے نا۔ جسے تنے کی پتھ کہتے
ہیں۔ اس پتھ میں سے صندل کا تیل نکلتا ہے۔

چاند رمتی نے کہا۔ اب جلدی چلو جی! شاہی محل دیکھیں گے۔ مگر ذ
جلدی جلدی۔ کیونکہ ابھی رستہ میں بہت سے دلچسپ مقام ا
بھی آنے والے ہیں۔

ان شاہی محلات کی کچھ عمارتیں چار سو برس اور کچھ عمارتیں ؟
سو برس پرانی تھیں۔ یہ شاہی محل ملبار طرز تعمیر کے اچھے نمونے تھے
گوشہ سقف ناریل کے پتوں کی طرح ترچھے ہوئے۔ حضرت الہرا تنے کا کو
مرمر، کمبودی ستون، ساگوان کے دلندیزی پلنگ، چینی ٹالے، کو
چیز ہندوستان کی ہے کونسی باہر کی ہے۔ کونسی چیز خالص ہے
کونسی چیز مخالص، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی نہیں آج سے پہلے کبھی اگ
نہیں ہوئی۔ کہیں پر ترقی ذرا پہلے ہو جاتی ہے۔ کہیں پر ذرا دیر میں زیا
زیادہ خون خرابہ سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ ساری تہذیبیں اور علم دفن
ہنر بنیے، نئے اور پرانے فلسفے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے
آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اور انسان کو ایک بہتر سماج کی طرف لیجا
رہے ہیں۔ چھ سو سال کے محلوں کو دیکھ کر بھی یہی گمان ہو
ہے جیسے یہ محل نہیں ہے۔ ماضی کی ندی ہے جس میں مختلف م
زندگی کے مختلف دھارے ایک دوسرے سے ٹکرا
آگے بڑھتے رہے ہیں۔

یہ محل چار منزل اونچے ہیں۔ فرینچ پروفیسر لیوی کا خیال ہے کہ
ان کا ملباری طرزِ تعمیر سب سے اعلیٰ ہے۔ اور یہ کہ سیام اور ہند
چینی اور چین میں بھی جو منگولیائی طرزِ تعمیر رائج ہے وہ دراصل یہیں سے
مستعار لیا گیا ہے۔ اس اونچے چار منزلہ محل میں ساگوان کی لکڑی لگائی گئی
ہے۔ چھ سو برس گذر جانے کے بعد بھی اسی طرح مضبوط ہے۔ سب سے
اوپر کی منزل میں شاہی خاندان کا دیوتا رہتا ہے۔ اس دیوتا کے کمرے میں آج
تک گھی کا چراغ جلتا ہے۔ گھی معلوم نہیں اصلی ہے کہ نقلی، لیکن چراغ پرانے
تیل کا ہے۔ اور اس پر ایک گھوڑ سوار کا ایسا خوبصورت بت بنا ہوا ہے
میں نے تو ایسا کہیں نہیں دیکھا۔ دیوتا کے کمرے میں چاروں طرف ہندو
دیومالا کی تصویریں ہیں جن پر چینی عنصر جھلکتا ہے۔ دیوتا کا پلنگ ساگوان کی
لکڑی کا ہے اور ولندیزی نمونے کا ہے۔ اسے ایک ڈچ بڑھئی نے
بنایا تھا۔ اس پر مافوق الفطرت جانوروں کی تصویریں ہیں اور ان کے بیچ
میں ایک صلیب کا نشان بھی ہے۔ سنا ہے کہ جب ٹراونکور اور کوچین
کی ریاستیں ضم ہونے لگیں۔ تو مہاراجہ نے کہا کہ وہ ذرا اپنے محل کے انتظ
بدلے اس کی اجازت دے لیں۔ مگر سردار پٹیل نہیں مانے اور ریاستیں

ایک دوسرے سے متعلق ہو گئیں ۔ شاید اب دیوتا اس محل میں نہیں رہتے
صرف لکڑی کے کھمبوں پر کھدے ہوئے ہرے طوطے اپنی چونچیں کھولے
ہوئے ایک خاموش گویائی سے کہہ رہے ہیں۔ رام رام ست ہے
رانیوں کے کمروں میں آئینے لگے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹے اور
دیواروں پر زیورات سے سجی ہوئی عورتوں کی تصویریں ہیں۔
کرشن جی کے بچپن کے مناظر ہیں۔ تصویروں میں عورتیں بے حد فربہ اندام
دکھائی دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کھانے کے سوا انہیں کبھی اور کوئی کام
نہیں ملا۔ شاہی خزانے کی زنجیر اور تالے پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے شاہی
خاندان کو ہندوستانی تالوں پر بھروسہ نہیں رہا۔ لنگر خانے میں ایک سو
سے زیادہ آدمیوں کے کھانے کی جگہ ہے مگر آج کل نمائش ہے اور
یہ بھی پرانے محل و دربار کی چوکیاں بہت اونچی ہیں اور درشن دینے
کے جھروکے پتھر کی مضبوط جالیوں سے ڈھکے ہوئے ہیں تاکہ درشن کے
بہانے سے کوئی دشمن مہاراجہ پر تیر ہی نہ پھینک دے ایک کمرہ میں لوہے
کا پنجرہ ہے جس میں آدمی کو زندہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور زندہ رہنا کیوں کام
تھا۔ یہاں پرانے کوڑے ہے۔ زندہ جلانے کے برتن، اور دوسری سزاؤں
کے عبرتناک سامان ہیں مٹی کے بڑے بڑے منقش ظروف ہیں جن پر
آج سے بہت عرصہ پہلے ۔ جب کہ ہندوستان میں بھی آدمیوں کو زندہ
جلاتے تھے۔ ان مٹی کے برتنوں میں لاش کو بند کرکے زمین کا ندر دیتے
تھے۔ یہ ظروف آج بھی اس پرانے شاہی محل میں موجود ہیں۔ لیکن ست ہے

دلچسپ چیز اس سال سے محلی ہیں۔ وہ ایک تلوار ہے چمکیلی، لپلپاتی ہوئی تیز دھار والی۔ ایسی تلوار کی سیدھی تلوار جس سے ایک کسان وشنو بھگت نے مہاراجہ اور انگریزوں۔ دونوں کی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ کسان چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں اور پھر ریاست کے اہلکاروں اور مہاراجہ صاحب اور ان کے انگریزی راج کی بدسلوکیوں سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ انہوں نے بغاوت کر دی تھی۔ آج سے بہت عرصہ پہلے جب ابھی توپ تفنگ بھی نہ چلی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی لڑائی میں تلواروں کا استعمال ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں اس کسان نے ریاست اور انگریز کی دوہری طاقت کے خلاف لڑائی لڑی تھی۔ اور ان کے دشمنوں کا کہنا ہے کہ وہ بڑا بہادر اور جیالا کمانڈر تھا۔ اور بہت عرصے تک بڑی کامیابی سے اپنی تحریک کی سربراہی کرتا رہا۔ ایسی تحریکیں دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی خود برطانیہ اور یورپ میں بھی شاہنشاہی کے زمانے میں اٹھیں۔ اور سختی سے کچل دی گئیں۔ اس طرح آخر کو یہ تحریک بھی کچل دی گئی۔ کیونکہ ابھی اس کے پنپنے کا وقت نہ آیا تھا۔ اور وہ طبقہ پیدا نہ ہوا تھا جو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتا۔ مگر پھر بھی شاندار لڑائی حق اور انصاف کی حمایت میں جنوبی ہند کی پہاڑیوں میں لڑی گئی اور آخر کار جب وہ کسان وشنو بھگت گرفتار ہوا تو اسے پھانسی کی سزا ہوئی، حالانکہ اسے بتایا گیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا تو اسے کچھ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن گرفتار کرنے کے

بعد ہی اُسے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اور پھر پیشتر اس کے دشمن اسے ذلیل کر کے عوام کے سامنے پھانسی دیں، اس دیش بھگت نے اپنی فولادی تلوار اپنے کلیجے میں گھونپ لی اور اپنے حریفوں کو جُل دے گیا۔

آج یہ تلوار اور اس کا فولادی بیج شاہی محل کی دیوار پر آویزاں ہے۔ اور یاد تازہ کرتا ہے۔ ان تمام جیالے مرنے والے شہیدوں کی جنھوں نے ہر ملک میں، اور ہر قوم میں اشتراکیت کی منزل کو قریب لانے میں اپنا لہو دیا ہے۔ کچھ لوگ اشتراکیت کو باہر والا اجنبی فلسفہ سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ایک عالمگیر تحریک رہی ہے جس کی آبیاری میں، ترویج و اشاعت میں دنیا کے ہر خطے کے لوگوں نے حصہ لیا ہے، یہ سمندر قطرہ قطرہ کر کے بنا ہے، یہ موڑ جو آج ہماری زندگی میں آیا ہے، کئی سو سال پیچھے سے آیا ہے۔ کئی ملکوں سے گذرا ہے۔ اور نئی بیانی اور پرانی ہواؤں کی خوشبو لایا ہے، یہ خوشبو جو آج چاروں سو بس رہی ہے۔ اس کی مہک میں کتنے صدیوں کے انسانی عمل کا تمام تر تسلسل ہے، روسی عمل اور جرمن فلسفہ اور انگریزی وجدان، اور چینی فراست؛

اور اس میں یہ پرانی ہندی تلوار بھی شامل ہے جو اس شاہی محل کی دیوار سے لٹک رہی ہے۔

شاہی محل سے نکل کر ہم لوگ قصبے کے چھوٹے سے بازار سے گذرنے لگے تو راجن نے کہا۔ "اس جگہ ہمارے کیرلا کی مزدور تحریک کا پہلا شہید کیشو پیدا ہوا تھا۔ یہ کالی جھوک ..... لڑائی .... شہادت ...... لیکن آخر میں فتح ہے، لڑائی تاگزیر ہے، شہادت بھی لڑائی کا لازم ہے۔ لیکن کیشو کے کیرلا کی فتح ضرور ہوگی چاہے اس میں کتنے ہی سال کیوں نہ لگ جائیں۔" تلیس نے باہر دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

راجن نے کہا۔ "بدقسمتی سے یہاں تمہارا کیرلا ختم ہو رہا ہے۔"

راجن کی کار اس موڑ پر تھی۔ جہاں سے تامل ناڈو کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اور کیرلا کا خاص علاقہ ختم ہوتا تھا یہاں کے لوگوں کا لباس قدرے مختلف ہوتا جا رہا تھا۔ بالخصوص عورتوں کا لباس اور زبان بلیالم کے بجائے تامل تھی۔ گاڑی اس وقت نشیب میں جا رہی تھی۔ اور مغربی اور مشرقی گھاٹ دونوں اطراف سے سمٹتے ہوئے ایک ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا بھی بحیرہ معتدلہ کے علاقہ کی معلوم ہو رہی تھی۔ یہاں ناریل کے بجائے پالمائیرا کے درخت نظر آرہے تھے، شہتوت، اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ لائم اور سبٹرس کے پیڑ ...... نیچے ایک شاداب سی وادی میں نگرکوئل کا شہر نظر آرہا تھا۔ جہاں پیلے گلاب کھلتے ہیں، جہاں پیتل کے پرانے ظروف بکتے ہیں۔ اور روپہلی رنگت کی حسین تامل لڑکیاں ریشم کے کپڑے بنتی ہیں

اوران پر ہزاروں برس کی پرانی پانڈی تہذیب کے نقش ابا گر کرتی ہیں ناگ مالا، ناہی کے نازک خطوط، گھنگرو کی طرح لٹکے ہوئے کنول۔

مگر کوئل کے ڈاک بنگلے کے اندر جاتے ہوئے راجن نے کہا۔ یہاں چائے پی کے سچنیدرم کا مندر دیکھنے چلیں گے۔

اس مندر میں کیا خاص بات ہے؟

راجن نے کہا، وہاں ننگی عورتوں کے بت ہیں، اور ایسے بت بھی ہیں جہاں مرد اور عورت دونوں داد عشرت دیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور بھی مختلف مناظر۔۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے کہا۔ پتھروں کا کوک شاستر میں اس سے پہلے ایلورا کے غاروں میں دیکھ چکا ہوں۔ اب میں دوبارہ اس غلاظت کو دیکھنے کیوں جاؤں۔

واہ اس میں غلاظت کیسی؟ کورین نے اپنا چشمہ ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ یہ بت ہماری پرانی تہذیب کے نشان ہیں۔

میں نے کہا۔ ہر پرانی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ مقدس نہیں ہوتی۔ یا معروف نہیں ہوتی۔ پرانے نشان ہماری تہذیب کے تو سارناتھ میں بھی پائے جاتے ہیں اور سانچی میں بھی، اور اجنتا میں بھی اور ایلورا کے بعض غاروں میں بھی۔ لیکن جس فن کا مظاہرہ ایلورا کے کام مندر یا آپ کے سچنیدرم کی دیواروں پر کیا گیا ہے۔ اس سے اگر ہم لوگ دور ہی رہیں تو اچھا ہے

ہم لوگ عرپانی پہ باتیں کرتے کرتے چائے پینے بیٹھ گئے، اور اتنے میں دوسری گاڑی بھی آن پہنچی جس میں ہمارے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پاروورت جو شاعر تھا، رمنن جو طالب علم تھا اور تنقید نگار تھا، رام کشن جو کوئی لون سے آیا تھا۔ سیٹی آ۔ جس کے سنگلاخ چہرہ پہ کشمکش اور لڑائی کے نشان موجود تھے۔ جس کا چہرہ جامد اور ساکت تھا جو کبھی مسکراتا نہیں تھا۔ لیکن جب مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی سیاہ چٹان کے سینے سے شفاف ندی ابل پڑی اور بل کھاتی ہوئی سارے منظر کو سیراب کرتی ہوئی آگے جا رہی ہے۔ مسکراہٹ جو پانی کی طرح نرم اور کرن کی طرح روشن ہے۔ میں نے گوپی سے پوچھا۔ سیٹی آپ نے یہ مسکراہٹ کہاں سے لی۔

گوپی نے کہا تم سیٹی آ کو نہیں جانتے۔ اس پہ لڑکا بڑا اثر ہے۔ دو سال ہوئے سچنیدرم کے مندر کا سالانہ میلہ تھا۔ کوئی ایک لاکھ کے قریب جاتری ہوں گے۔ جو اندر دیوتا کے درشن کرنے آئے تھے۔ سچنیدرم میں آ کے اندر نے پراسچت کیا تھا۔

پراسچت؟ اندر کو پراسچت کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے پوچھا۔

گوپی نے کہا ـــــ وہی اہلیہ بائی والا قصہ ہے۔ جب اندر دیوتا نے گوتم رشی کی غیر حاضری میں گوتم رشی کا سا بھیس بنا کے اہلیہ

سے ہم بستری کی تو گوتم رشی نے جل کے اسے سراپ دے دیا، بیچاری اہلیہ تو اسی سراپ کے زیر اثر پتھر کے بت میں تبدیل ہو گئی۔ اور اندر کے جسم کے ہر ذرے پر مرد کے اعضائے تناسل کی تصویر کھنچ گئی۔ اندر دیوتا اس عجیب و غریب سراپ سے بے حد شرمندہ ہوئے کہیں، منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اس لئے یہاں آکے انھوں نے پراسچت کیا۔ اور تپسیا کے زور سے اپنے گناہ کے زہر کو اپنے جسم سے نکال دیا۔ اور ان کا جسم پھر کھلا چنگا ہو گیا۔ اس واقعہ کی یاد میں یہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ اور اندر دیوتا کی مورتی ایک بہت بڑے رتھ پر نکلتی ہے، یہ رتھ ۵۰ فٹ اونچا ہے۔ اور اس میں لکڑی کے ۳۰ پہیے لگے ہوئے ہیں، اور ہزاروں جاتری اسے اپنے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے لیجاتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ اس بیچاری اہلیہ کا کیا ہوا۔

گوپی نے کہا۔ عورت کو مرد سے زیادہ سزا ملتی ہے کم از کم اپنی تہذیب میں یہی درج ہے۔ اسلئے اہلیہ کو اندر کے اچھا ہو جانے کے بعد بھی کئی سو سال تک پتھر کا بت بن کے لوگوں کے قدموں میں رہنا پڑا۔ حتےٰ کہ ایک روز شری رام چندر نے اس دھرتی پر اوتار لیا اور جب وہ دھنش توڑ کر سیتا کو بیاہنے کے لئے جنک پور جا رہے تھے تو رستے میں پڑے ہوئے ایک پتھر سے انھیں ٹھوکر لگی، یہ اہلیہ کا بت تھا۔ شری رام کے پاؤں چھوتے ہی پتھر میں جان آگئی، اور

یہ شہری رام شہری رام کہتے بات چوڑتی ہوئی آسمان پہ اپنے حسا وند تم رشی کے پاس چلی گئی۔

میں نے کہا سالا لکہ راہیہ کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا، کیونکہ اندر دیوتا ل گوتم کا بھیس بدل کے آیا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جب دیوتا بھیس بدل لیں تو وہ کس صفائی سے کام کر سکتے ہیں۔ میں دیوتاؤں کو نہیں جانتا۔ چند معمولی بہروپیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اس ناتی سے بھیس بدل کے بھارت ماتا کو وہ غچہ دیا ہے کہ بے چاری تک سپتر کا لکھ ابھی بھی فرشِ خاک پہ لوٹ رہی ہے۔

گوپی نے کہا۔ ایسی ہی کی بات سنو۔ یہ حضرت مین میلہ کی بہار جب جہالا ج اندر کا رتھ میدان میں آچل رہا تھا۔ اس دس افٹ اونچے پر چڑھ گئے۔ اور اوپر چڑھتے ہی چلے گئے۔ لوگوں نے ہزار چیخا چلایا مگر آپ نے کسی کی نہیں سنی۔ اور رتھ کے بالکل اوپر چوٹی پہ جا کے اندر دیوتا کا جھنڈا اتار دیا۔ اور وہاں پر لال جھنڈا دیا۔

لال جھنڈا؟ ہا ہا ہا ۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ اندر دیوتا کے رتھ پر مزدوروں اور کسانوں کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اس کے بعد بھی آنے اوپر ہی سے انقلاب زندہ باد اشتراکیت زندہ باد اور سرمایہ داری مردہ باد کے نعرے شروع کر دیے۔ یہ آج سے دو سو سال پہلے کی بات ہے

پولیس پہلے تو ابھی میں رہی لیکن جب لوگوں نے ان نعروں کو آسمان میں گونجا دیا تو انھوں نے اندر دیوتا کی حفاظت کرنے کے لئے گولی چلائی۔ کئی لوگ ڈر کر چلے، بارہ آدمی مر گئے۔ مگر سبھی آکے ایک گولی بھی نہ لگی۔ اور نہ لال جھنڈا لکڑی سے اترا۔

پھر ــــ؟

راجن نے کہا۔ اس دن سے لوگوں کا اعتقاد اندر دیوتا پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ سوچتے ہیں۔ پرانے جھنڈے سے لال جھنڈا مضبوط ہوتا ہے۔

پھر ــــ؟

راجن نے کہا ــــ اس دن سے لوگوں کا اعتقاد اندر دیوتا پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ سوچتے ہیں۔ پرانے جھنڈے سے لال جھنڈا مضبوط معلوم ہوتا ہے۔

گوپی نے کہا۔ اس سال سے میلے کی آمدنی آدھی سے بھی کم ہے۔ اور پجاری لوگ۔ پوجا کرنے کے بجائے آجکل کمیونسٹوں کو گالیاں دینے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

چارودت نے کہا۔ افیون گھوٹتے ہیں بیچارے۔ مارکس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

رمنی نے چائے کا پیالہ ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا جناب اگر آپ چائے پی کر فارغ ہو گئے ہوں تو مندر کی طرف چلا جائے

میں نے پھر معذرت پیش کی ۔ گویا لوگوں نے مجھے دھر لیا ۔
کہنے لگے صاحب اس میں کیا برائی ہے ، کیا جنس کی تصویر پیش کرنا گناہ ہے ، کیا عورت ، مرد کا اختلاط باہم کوئی بری شے ہے ، اور اس میں برائی کیوں ہے تو ایسے سنگتراش اپنے فن میں کیوں نہیں پیش کر سکتا ہے ؟

میں نے کہا ۔ جنس میں کوئی برائی نہیں ہے ۔ جنس کا اظہار ادب میں ہوتا ہے ۔ ہر فن میں ہوتا ہے ۔ ہم بھی محبوب کا سراپا بڑے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ لیکن پھر کبھی کی طرح محبوب کے پاخانے پر اتنا زور قلم صرف نہیں کرتے ۔ یہ فحاشی ہوگی اسی طرح مرد اور عورت کی محبت ہے ۔ محبت کا اظہار بڑی ہی خوبصورتی اور فن کاری سے ہو سکتا ہے ۔ لیکن یہ ۔ یہ تو محبت کا اظہار نہیں ہے ۔ جنس پرستی ہے اس قسم کا فن آدمی کو اوپر نہیں لے جاتا نیچے کھینچتا ہے ۔ وہ سفلی جذبات کو ابھارتا ہے ، اور اکساتا ہے ۔ اور برانگیختہ کرتا ہے ۔ یہ نشاط نہیں ہے ۔ ہوس ہے ۔

تو پھر اتنی بری شے ہمارے مندروں میں کیسے داخل ہو گئی ۔
راجن نے کہا ۔ جب سماج روبہ انحطاط ہوتا ہے ۔ زندگی کے ہر شعبہ پر اس کا اثر پڑتا ہے ۔ گپتا خاندان کے عروج کی سنگتراشی دیکھئے اور پھر اس کے زوال کی ہمہ گیری ملاحظہ فرمائیے ۔ ایک طرف طاقت پاکیزگی اور اونچائی اور مضبوطی کا احساس ہوتا ہے ۔ دوسری طرف ..

گھٹیا سستے اور رذیل ترفن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایسا فن
ہے اندر تخلیق کے جوہر کہ نہ پاکر سستے ہوس انگیز جذبات کا سہ
لے کر لوگوں میں مقبول بننا چاہتا ہے۔

پیر اسے کہا۔ یہ وہی اتنیاز ہے جو مغلوں کے دقت میں اکبر
زمانے کے فتح پور سیکری اور واجد علی شاہ کے لکھنوی طرز تعمیر
تاج اور چھتر منزل میں ہے۔ جو خیال اور ٹھمری میں

لیکن ہم تو ضرور ———— رمنن کہنے لگا۔
گوپی نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ ضرور جانا چاہیئے
کو دیکھئے آپ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ میں بھی چلنا ہوا
کے ساتھ لیکن ذرا جلدی سے لوٹ آئیں گے۔ غروب
سے پہلے کنیا کماری پہونچنا چاہیئے۔ ورنہ مزا نہیں
آئے گا۔

سورج کنیا کماری پر غروب ہو رہا تھا۔ کنیا کماری کماری
مشرقی اور مغربی گھاٹ دونوں آکے ملجاتے ہیں۔ کنیا
جہاں تین سمندر آکے گلے ملتے ہیں۔ بحر عرب۔ بحر بنگال اور
اور یہ تینوں سمندر ایک عظیم الشان نیم دائرے

پھیلے ہوئے ہیں۔ اور بیچ میں زمین کی آخری نوک ہے۔ اور کنیا کی گلابی
ریت پر تینوں سمندروں کی لہریں ایک دوسرے کے گلے
مل کر مچل مچل کر رقص کر رہی ہیں۔

سطح زمین کے آخری قدموں پر کھڑا ہو کے میں نے جنوب سے
شمال کی جانب دیکھا جہاں کبھی میرا گھر تھا۔ میرے بھائی تھے،
میرے بازار اور شہر تھے، گاؤں تھے، کھیت تھے، ہنسی تھی
اور کسی کے چھپتے تھے، ہیر کے نازک قدم تھے۔ رانجھے کی
رسیلی بنسلی تھی اور میں جو کسی شہر اور کسی ملک کا نہیں ہوں جو کسی
مذہب اور کسی گلی کا نہیں ہوں، جو کسی شمال اور کسی جنوب کا
نہیں ہوں، کسی شرق اور کسی مغرب کا نہیں ہوں، جس کا دل ساری
دنیا ہے۔ اور روح خانہ بدوش ہے کس لئے میرے دل نے
کنیا کماری پر کھڑے ہو کے ایک لمحے میں ان کھیتوں کو دیکھ لیا
جہاں کبھی میرا بچپن گذرا تھا۔ جہاں کبھی میری بیقرار جوانی اٹھی تھی اور
جہاں زندگی اپنے آخری لمحے کی مٹی چاہتی ہے۔

شاید میرے دل میں وہی پرانی مٹی بول رہی ہے۔ ہزاروں میل پرے
کی دور زمین کی سنہری یاد سینے میں میٹھی میٹھی کسک لئے بیدار
ہو رہی ہے۔ میں تجھے یاد کرتا ہوں اے میرے پاک صاف
خوبصورت پنجاب کی سرزمین میں تجھے یاد کرتا ہوں کہ دنیا میں کوئی
دوسری جاگیر نہیں۔ اور کوئی دوسرا جہاں نہیں ہے اور

سرسوں کے ساگ کا سوندھا پن کہیں نہیں ہے ۔ میں تجھے یا
ہوں ایک ماں کی طرح دو ماؤں کی طرح نہیں ۔ کیونکہ بچے کی صرف
ماں ہوتی ہے ۔ اور بچہ اکیلے میں اپنی ماں کو یاد کر سکتا ہے ۔ اس
صداقت اور محبت کے ساتھ جس کے سامنے دنیا کی سا
سیاسی اور ہنگامی شعبدہ بازیاں ختم ہو جاتی ہیں ۔ میں یاد کرتا ہو
تجھے اپنے ان آنسوؤں کا سلام بھیجتا ہوں جن کے سامنے
کا پانی بھی کم ہے ۔

میرے غم کا اندازہ میرے ساتھیوں کو ہے ۔ کیونکہ یہ لوگ
زمین سے پیار کرتے ہیں ۔ اپنے گھر سے اپنے بیوی بچوں
پیار کرتے ہیں ۔ انھیں بھی وہ کھمبا عزیز ہے جس کی تاروں پر
کی خبر آتی ہے ۔ وہ ٹوٹا ہوا مکان پسند ہے جس کی اوٹ میں محبت
بوسہ لیا تھا ۔ وہ تالاب عزیز ہے جس میں کرک پائل کی ہری
چاروں طرف پھیلی ہوتی ہیں ۔ یہ لوگ جو میرے ساتھی ہیں
انسان علم اور ترقی سے پیار کرتے ہیں ۔ اسلئے یہ اس غم کو
ہیں ۔ جب بیٹے ماؤں کی آغوش سے زبردستی جدا کر دیئے
کنیا کماری کی آخری چٹان پر کھڑا ہو کے میں سامنے بکھر
ہوں جو انسان کی ترقی کی طرح ناپید کنارہ ہے ۔ پھر میں مغ
سمت سے آنے والے بحرِ عرب کو دیکھتا ہوں جس نے آٹھ
پہلے میرے ملک میں اک انقلاب پیدا کر دیا تھا

یک ہزار سال پہلے مسیح کے چیلے اس ساحل پر آ گئے تھے سے بارہ سو سال پندرہ سو سال پہلے ہند کی کشتیاں اور رم کو گئے تھے، روم اور قبرص اور یونان کی سمت سے ہیں ادھر سے ادھر آئی تھیں اور ادھر سے ادھر گئی تھیں ہبوں، خونوں اور تہذیبوں کی آمیزش ہوئی تھی۔

پھر میں مشرق کی جانب دیکھتا ہوں بحیرہ بنگال مشرق کی ہوائیں ، برما، سیام، ملایا، ہند چین کی فضائیں لڑائی کے گیت گاتے اڑتی چلی آتی ہیں۔ وہاں کبھی گیت دیش، قومیں، مذہب اور یاں چھینی گئی تھیں۔ وہاں کبھی کسانوں سے زمین مزدوروں رخانے ہتھیا لیے گئے تھے، وہاں کبھی بدیسی بندوقوں سے کا گلا گھونٹا جاتا تھا۔ ادیبوں کے گلے پر چھری رکھی تھی۔ اور ان کی کو آگ لگائی تھی۔

اور آج مشرق کے سمندروں کے پانی کیا کہتے ہیں۔

ایک قدم آگے۔

دو قدم آگے۔

تین قدم آگے۔

تینوں سمندر مل گئے۔ عرب، ایران، ہندوستان اور ایک ہوئے ریت کے آخری ذروں پر بھی پانی کی موج ظفریاب اور ہنستے ہنستے کہنے لگی، کام کرنے والوں کا کوئی ملک نہیں

ہوتا، کوئی رنگ نہیں ہوتا، کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ سب انسان ہوتے ہیں۔ اور ساری دنیا کے وارث ہوتے ہیں۔

یکایک آفتاب غروب ہو گیا۔ اور راج ہنس کی طرح اڑتے ہوئے سفید بادلوں کے پنکھ لال ہوتے گئے۔ شفق دور دور تک سمندر کے کھیتوں میں ایک گلنار فصل کی طرح کھلتی گئی۔ اور پھر یہ آخری چٹان کے اوپر چڑھتی گئیں اور دور دور اوپر آسمان بادلوں کے مرغولے پھیلتے گئے۔ اور ان میں برجیاں، گنبد، ستون اور طلائی چھتریاں ابھرتی گئیں۔ سنہرے بادل پھولتے گئے، پھیلتے گئے۔ ایک سنہرے گنبد کے اوپر دوسرا سنہرا گنبد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرخ ہوا، قرمزی گوٹیں، جھلملاتے ہوئے حاشیئے زمین اور آسمان ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ چاروں طرف رنگ میں رنگ تھا۔ اور سمندر کی لہریں سو رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چارودت شاعر ایک عجیب محویت کے عالم میں بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس سیمی کھڑی تھی کنیا کماری کی آخری چٹان کی طرح مضبوط اور سادہ دونوں کے چہرے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے،

چارودت نے آہستہ سے کہا۔ سیمی آؤ دیکھو ایسا معلوم ہے جیسے غلاظت سے پاک صاف۔ ندر دیوتا کا رتھ جا رہا۔ ایک نیا سچیدرم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سمیٔ آ نے مسکرا کے کہا۔ لیکن اس رتھ کے اوپر بھی
را جھنڈا لہرا رہا ہے۔

MANSOOR BROTHERS
No.....................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

اگر الوائی سے ترا وینڈرم کا علاقہ کیرالا کا کوہستانی وطن ہے، تو
وینڈرم سے کوئی لون کا علاقہ اس کی سمندری بندرتا ہے
ل افق پر سمندر کا کنارا چمکتا ہے، اور اس افق پہ اور کاڑی کی۔
رکی کے بیچ میں آب و رنگ کے صدہا دلکش مناظر ہیں جو ترسی ہوتی نگاہ
شاداب کرتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن قدرت
جو تصویر ذہن میں دیر تک چمکتی رہتی ہے۔ وہ میلوں تک پھیلے ہوئے
پل کے زمردیں جھنڈ ہیں۔ جن کی گود میں بیک واٹرز کی خوشنما جھیلیں
م کے نگینوں کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان جھیلوں کی سطح آب
یادلوں کے شفاف محل نظر آتے ہیں۔ یا کبھی کبھی امیرزادوں کی نفیس
شتیاں جن کی کھڑکیوں کے رنگین پردے جھولتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ یہ امیر زادے یہاں خون کا دباؤ ٹھیک ہو جانے سے اپنی صحت
ٹھیک کرنے آتے ہیں۔ یہاں ابھی زندگی کی ریل پیل میں کام کرنے والا وہ
بہت کشش نہیں رکھتا جس کی زندگی پر دباؤ پہلے سے دوگنا بڑھ گیا ہے
اور جو محض اپنی زندگی میں کارخانے کی چمنی کے دھوئیں اور اپنی غلیظ تنگ
چال کی غلیظ تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔ جو یہ نہیں جانتا کہ زمین کتنی
خوبصورت ہے۔ جو صرف یہ جانتا ہے کہ صرف زندگی ہر لحظہ اداس
اور بدصورت ہوتی ہے۔ اور ٹکٹکی بٹھا کے دیکھتے ہیں، آج وہ
مزدور یہاں نہیں ہے۔ لیکن کبھی یہ غریب کشتیاں اور ان کی منقش
کھڑکیاں اس کے لئے کھل جائیں گی۔ اور ننگے پیروں پر دوستوں کے ساتھ ہوا میں
سر اٹھاتے ہوئے اسے خوش آمدید کہیں گے۔

ٹراونڈرم سے کوئی لون تک کا علاقہ مجھے سب سے غریب نظر آیا
یہاں کی زمین کا بیشتر حصہ ریتلا ہے۔ اور اس لئے کاشت کے
ناقابل ہے۔ عوام کا گذارا ناریل کے درخت پر ہے۔ یہ درخت
جڑ سے لے کے آخری حصے سے لے کے چوٹی کی پھننگ تک کام آتا ہے
ہر حصہ۔ ہم لوگوں نے ایک سرکاری فلم دیکھی تھی جس میں ناریل کے درخت
کو سونے کا درخت بتایا گیا تھا۔ اس فلم میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کس
طرح اس درخت کا ہر حصہ عوام کے کام آتا ہے۔ اس کی لکڑی سے
مختلف گھریلو سامان تیار ہوتا ہے۔ ناریل کے پتوں سے چھت
اور پردے اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ ٹوپیاں بنتی ہیں ناریل

انی پیا جاتا ہے۔ ناریل کا گودا کھایا جاتا ہے۔ اور اس سے انواع و
ام کے سالن تیار کئے جاتے ہیں، گودے میں سے تیل نکلتا ہے
بیبوں کام آتا ہے۔ ناریل کے ریشے سے دریاں، قالیچے اور
سرا سامان تیار ہوتا ہے، پوری نظم میں ناریل کی تعریف ایسے کی گئی
یسے وہ کوئی درخت نہ ہو۔ دیوتا ہو۔ پیڑ کی تعریف بے جا
یں لیکن جس چیز کی طرف اس نظم میں اور اس نظم سے باہر کی دنیا
اسے کار دھیان نہیں دیتی۔ وہ ہمارے عام انسانوں کی عظمت
ہے جو ناریل کے درخت کے ہر رگ و ریشہ کو اپنے کام میں لایا۔ یہ
ری محنت یہ ساری اپج۔ یہ ساری دریافت اسی کی ہے جس نے
ر روزمرہ کی محنت سے ناریل کے درخت کے ہر حصے کو اپنی
دگی کی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ ہمیں سرکار سے
کایت ہے تو یہی کہ وہ درختوں کی عظمت کا اقرار کرتی ہے لیکن
انوں کی عظمت کا اقرار نہیں کرتی۔ ابھی تو یہ ایک ناریل کا درخت
ہے، ذرا کام کرنے والے انسان کو کھل کر ترقی کا موقع دیجئے اس
ماحول کو سازگار بنائیے۔ اس علم و فن اور سائنس سے بہرہ
ہونے دیجئے وہ اس عالم نباتات سے آپ کو سیکڑوں ایسے
و نیر کے درخت ڈھونڈ دے گا۔ کہ جو اپنی افادیت میں
یل کے درخت کو بھی مات کر دیں گے۔

جب میں ٹرا ونڈرم سے کوئی لون جانے والی گاڑی میں بیٹھا تو راستہ میں تین بار ٹکٹ چیکر نے میرا ٹکٹ دیکھا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا نام کیا ہے۔ اور میں کوئی لون میں کیا کرنے جا رہا ہوں اس بات پر مجھے چنداں حیرت نہ ہوئی۔ کہ گاڑی کے کارندوں کو اپنا آنا پتا معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دیکھکر ضرور بڑی حیرت اور مسرت بھی ہوئی کہ ٹرا ونڈرم اور کوئی لون کے بیچ کے علاقہ میں بھی جہاں جہاں سے ہماری گاڑی گذرتی ہے لوگوں کو اپنی آمد کی اطلاع مل چکی تھی کیسے؟ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اکثر چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر میں نے دیکھا کہ لوگ لال جھنڈے لئے ہمارے سواگت کو کھڑے ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں اور کوئی لون جانے کے لئے ہمارے ساتھ ڈبہ میں بیٹھے جا رہے ہیں، اور جہاں پہ گاڑی نہیں رکتی تھی وہاں پہ بھی جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے دیہات کی سد بندیوں کے باہر میں نے دس بیس پچاس سو کے گروہوں کو جھنڈے ہلاتے ہوئے ہماری گذرتی ہوئی گاڑی کا سواگت کرتے ہوئے دیکھا، گاڑی میں بیٹھے ہوئے ساتھی ان کے نعروں کا جواب دیتے رہتے جبتک کہ گاڑی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی، ساتھیوں نے گاڑی کو ٹرا ونڈرم سے

دئی لون تک ایک اچھا خاصا چلتا پھرتا جلوس بنا لیا۔ کوئی لون پہنچ کر ہم لوگ باقاعدہ جلوس کی صورت میں سٹیشن پر کھڑے ہو گئے۔ سٹیشن کے باہر سے دو تین سو طلبہ اندر آئے اور اسٹیشن کی فضا انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج گئی۔ وہاں سے ہم سب لوگ پھر ایک جلسہ کی صورت میں اس مسافر خانہ کو روانہ ہو گئے جہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔

طالب علم میری طرف خوشی سے دیکھتے اور نعرے لگاتے۔

"ودیارتھی اسے ڈتو کا رآئیکم حیدہ باد"

"طالب علموں اور ادیبوں کا اتحاد زندہ باد"

پھر ایک مزدور نے نعرہ لگایا۔

"تولائی ودیارتھی اسے ڈتو کارآئیکم زندہ باد"

"مزدوروں۔ طالب علموں اور ادیبوں کا اتحاد زندہ باد"

پھر یکا یک کسی نے کہا۔ علی سردار جعفری زندہ باد

اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چلتے چلتے سردار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور میں گھوم کر اس مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے جسم کے روئیں روئیں میں ایک عجیب سی خوشی اور انبساط کا احساس رچ گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ یہ جلوس میرا نہ تھا۔ یہ جلوس سردار کا تھا۔ اور سلیمان ادیب کا اور رشید جہاں کا اور امرت رائے کا۔ اور نیا عہد رکا اور

گوپال ہلدر کا، پرودنیر شا ہد کا اور ناگ ارجن پہاڑی اور رامر شیخ کا، اور ریوسعت منان، اور لنکا پا کا اور سیکڑوں ترقی پسند ادیبوں کا جو آج ہندوستان میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیئے گئے ہیں۔ جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اور اس کے اندر رہنے والے کروڑوں انسانوں سے پیار کرتے ہیں کیونکہ ملک کسی ایک اینٹ پتھر یا درخت کا نام نہیں ہے ملک کسی ایک عمارت ایک جھنڈے یا ایک فرد کی تابعداری کا نام نہیں ہے۔ ملک ان تمام انسانوں سے بنتا ہے جو اس میں رہتے ہیں اور اپنی خون پسینہ کی محنت سے اس کے کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں اس کے کارخانوں میں چرخیاں گھماتے ہیں۔ اس کی کانوں سے کوئلہ اور لوہا نکالتے ہیں۔ اور اس کے دفتروں اور کالجوں اور اسکولوں میں انسانی محنت کا لازوال اور اس کی ترقی کے رجحان کا پتہ چلاتے ہیں انسان سے محبت کرنا، ملک سے محبت کرنا ہے۔ اور اس کے بہترین مستقبل سے محبت کرنا ہے۔ کوئی لون کی سڑک پر چلتے ہوئے اس وقت میں اپنے ان تمام محب الوطن ادیبوں کو دیکھ رہا تھا جو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے میرے ساتھ چل رہے تھے۔ ان میں کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری بھی تھے۔ جو آج اپنا نام لے کر بمبئی کی سڑکوں پر نہیں چل سکتے۔ ان میں پاکستان کے عبد اللہ گوشہ عبداللہ ملک، ابراہیم جلیس اور عارف جلالی

بھی تھے۔ ان میں پیبلو نرودا بھی تھا جس کے خلاف چلی کی
پولیس کا وارنٹ ہے اور اور ہاورڈسٹ اور لوئی آراگاں
اور ایلیا اہرن برگ اور شولوخاف اور نمائندے وہ تمام عظیم
رہبر اور فلسفی اور نکہت وراں جنہیں اس ساری دھرتی سے پیار
ہے اس کے انسانوں سے پیار ہے۔ ان کے بچوں سے پیار ہے
اس جلوس میں ان کے مضبوط ہاتھ تھے۔ اور بیدار دماغ تھے
اور روشن مسکراہٹ تھی۔ اور یہ سب لوگ آج ایک جلوس کی
شکل میں اسی جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے جو انسان کا جھنڈا
ہے جو امن کا پرچم ہے۔ جو حیات نو کا علم ہے۔

کوئی لون کے جلسے میں تریچور کے بعد سب جگہوں سے ا
حاضری تھی کوئی پانچ سات ہزار کے قریب لوگ ہوں گے۔ جلسہ
ناراٹن کالج کے وسیع میدان میں منعقد کیا گیا۔ طالب علم ایک ہزار
قریب ہوں، باقی لوگ کوئی لون کے شہری تھے کوئی لون ایک ا
خاصا صنعتی مرکز ہے۔ یہاں کے لوکو شیڈ میں چار سو ریلوے
مزدور کام کرتے ہیں۔ اے ڈی اکاٹن ملز اٹھارہ سو کے قریب
ہیں۔ ان میں سے آجکل پانچسو کے قریب مزدوروں کی چھٹنی
ہے۔ اس کے علاوہ کوئی لون میں کیشو نٹ تیار کرنے کی فیکٹریاں
جن میں پچانوے فیصدی عورتیں کام کرتی ہیں، کوئی لون اور اس
نواحات کو یہ کہ صرف ایک اس صنعت میں پندرہ ہزار کے
عورتیں کام کرتی ہیں، کیشو نٹ فیکٹریوں کے مزدوروں کی لال یہ

بڑی مضبوط سمجھی جاتی ہے۔ اس یونین کے صدر گا مریڈ گووندن نائر ہیں جو کیرلا کے عوام میں بہت مقبول ہیں۔ ان کی شخصیت کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ عوام نے انھیں اپنی دیومالا میں کر لیا ہے۔ اور ان کی بہادری اور اہمیت اور شجاعت کے متعلق بہت سے قصے کہانیاں بھی گڑھ لئے ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے بہت سے دوسرے طبقوں یعنی سرکاری اور کانگرسی لوگوں کو بھی ان کی تعریف کرتے سنا نے۔

کوئی لون کے طالب علم بھی ٹراونڈرم کے طالب علموں کی طرح عوامی لڑائیوں میں اور تحریکوں میں کانگریس تحریک سے لے کر استنرا کی تحریک تک اپنا نمایاں پارٹ ادا کرتے آئے ہیں۔ اپنی مانگوں کے لئے تو خیر وہ لڑتے ہی ہیں۔ لیکن مزدور طبقے کی مانگوں کے لئے بھی وہ پوری طرح سے ساتھ دیتے ہیں۔ چنانچہ جب ٹراونکور کے ٹرانسپورٹ کے مزدوروں نے اپنی مانگوں کے سلسلے میں لڑائی چھیڑی تو طالب علموں نے پوری طرح ان کے ساتھ تعاون کیا جس کی بنا پر کوئی لون کے کالج کے بہت سے طلبہ نکالد یئے گئے۔ ان میں ادیبی مادھون بھی تھا جو آج ہمارے جلسے کا صدر تھا۔ اور جس نے اس ظلم کیخلاف احتجاج کرتے ہوئے مرن برت رکھ لیا۔ جب اس برت کو گیارہ روز ہوگئے اور مادھون کے کسی کے کہنے سننے پر بھی یہ فاقہ نہ ٹوٹا تو اسے ہسپتال پہنچایا گیا، یہاں پر، ایک پولیس کے سپاہی نے اُس سے بڑا دلچسپ انٹرویو کیا۔

سپاہی — تم یہ فاقہ کیوں کر رہے ہو ؟

مادھون — تم ہسپتال کے اندر کیوں آ گئے ہو

سپاہی — میری مرضی. تم بتاؤ۔ تم یہ فاقہ نہیں ت

مادھون — نہیں ۔

سپاہی — میں شراب نہیں پئے ہو
میں عقل کی بات تمھیں بتا رہا
تم یہ فاقہ توڑ دو ۔ نہیں تو تمہا
حق میں اچھا نہیں ہوگا ۔

مادھون — تمھیں میرے فاقے سے کیا
مطلب ہے

سپاہی — مطلب ہے تم اپنے ماں با
خیال نہیں کرتے تو ہسپتال
ہی کا کچھ خیال کرو (نرس کی طرف
کر کے) ان عورتوں کے سامنے فا
ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی

مادھون — میں تو ایک گھنٹے کے
بھی فاقہ کر سکتا ہوں ۔

سپاہی — اچھا اب میں تم کو بیٹھیں گا. گ
پیتے ہوئے نہیں ہوں ۔

اس سپاہی نے مادھون کو پیٹا اور ہسپتال میں ہلڑ مچ گیا
۔ لوگوں میں جوش و خروش اور بڑھ گیا۔ اور سارے شہر میں
ذلیل حرکت کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔ اس موقع پر سری
کرشنن نے جو کیرالا کومدی کے ایڈیٹر ہیں بیچ میں پڑ کر حکومت
طالب علموں کے درمیان تصفیہ کرا دیا۔ اور طالب علموں کی مانگیں
پوری کی گئیں۔ تب جا کے مادھون نے اپنا فاقہ توڑا۔
کالج کی دیواروں پر آج بھی چاک سے لکھا ہوا تھا۔ "مادھون
زندہ باد" اور مادھون مائیک پر کہہ رہا تھا۔ ہم ترقی پسند
ی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

طالب علموں کی سٹرائک کے سلسلے میں کوئی لون کے
ورکروں نے بھی ہڑتال کی تھی اور کوئی لون کے جرنلسٹوں نے
نمایاں حصہ لیا تھا۔ جن دنوں مادھون ہسپتال میں برت رکھے
ہوئے تھا۔ مزدور، جرنلسٹ، طالب علم، اور دوسرے شہری جلوس
کی صورت دوبار ہسپتال گئے تھے۔ کوئی لون کے جرنلسٹوں
بڑی بیداری پائی جاتی ہے۔ پریس کانفرنس میں ان سب کے متعلق
سوالات مجھ سے پوچھے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ [illegible]

کی طرح یہاں کے جرنلسٹ بھی ترقی پسند ادب سے
دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے اپنے روزناموں میں نمایاں
جگہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں کیرلم کے ایڈیٹر جی فلپس رہنا
اور نو بھارت ٹائمز اور کیرلا کومدی اور پادریا پربھا کے جرنلسٹوں
کا مزدور طبقے سے اتحاد اس درجے تک ترقی کر گیا ہے کہ ایک
دفعہ پولیس نے کیرلم کے سب ایڈیٹر کنتھن کو چھیڑا اور مزدوروں کی
لڑائی کے سلسلے میں پیٹ دیا۔ کیونکہ پولیس کے لوگوں کو کنٹ
رپورٹ جو اس نے اخبار میں دی تھی۔ پسند نہیں آئی
یہ اخباروں میں شائع ہوئی اور بعد میں حکومت
تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کی، مگر پھر وہ معاملہ ٹھپ ہو گیا۔
سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ مگر ایک بات ضرور
اور وہ یہ کہ اس واقعہ کے بعد طالب علم اور مزدور اور
اور دوسرے شہری اپنی مانگوں کے سلسلے میں ایک دو
سے متحد رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا
اور برابر ہوائی لڑائیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ شاید
آج کے جلسے میں یہ سات ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔

دو ایک روز میں کرسمس آنے والی تھی۔ میں نے فلپس
پوچھا کرسمس میں تم گھر جاؤ گے۔ یا میرے ساتھ الپی
گے؟

فلپس نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا، پھر بولا ——— میں
ـ سے ساتھ الپی جاؤں گا۔

پھر تھوڑی دیر کے لئے چپ رہا، پھر بولا۔ اچھا میں کسی اور
ار سے ساتھ الپی بھیج دوں گا۔ میں گھر جاؤں گا۔

پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ نہیں میں خود ہی چلتا ہوں بیوی کو خط
دیتا ہوں اس پہ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ فلپس کی شادی کو ابھی
ا ہوئے تھے۔ اور یہ شادی کے بعد میاں بیوی کی پہلی
س تھی۔ اس کے دل کے اندر جو کشمکش ہو رہی تھی اسے میں

بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا تھا۔ فرض اور محبت کی اس سی لڑائی میں آخر فرض نے فتح پائی۔ اور ہم لوگ ا ہو گئے۔

لاری کوہ پہنچنے سے پہلے ہی جاتی تھی۔ اس لئے ہم چار بجے ہی ہوٹل سے تیار ہو کے اڈے پر پہنچ گئے۔ رستے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ تارڑ کے جھنڈ دھند میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے۔ اور ارکناٹ کے سید سے تنے کھروں دھوئیں کی چادریں اوڑھے نظر آتے تھے۔ اور دھان کے میں سفید کہرا اس طرح چھایا ہوا تھا، جیسے بادل آسمان سے دھرتی پر سو گئے ہوں، ایک عجیب سی موہوم غنودگی اور چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ تاروں کی آنکھیں بھی جھپک جھ اور مسافر سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے انجن کی لوری سنتے سے لگتے ہیں۔ میں بڑے مزے میں سیٹ سے لگا سو رہا تھا ایک لاری کے رکنے کی آواز آئی اور اس کے دھچکے سے آد گئے۔ لیکن ابھی میری آنکھیں بند ہی تھیں، پھر میں کسی نے کہا۔

چائے۔ گرم گرم چائے
سنگترے۔ میٹھے سنگترے۔
مندر کے لئے چڑھاوا۔

یکایک میں نے آنکھیں کھولدیں۔ اور حیران ہو کے فلپس سے

— یہ کیا ماجرا ہے؟

فلپس نے بتایا۔ یہاں سے قریب ایک بہت بڑا پرانا۔ مندر

یہ آدمی اسی مندر کا ایجنٹ ہے۔ اور دھار تک جاتے ہوں

پڑھاوا وصول کرتا پھرتا ہے۔ اس کو چڑھاوے پر کمیشن

ہے۔

پھر آواز آئی۔

چائے۔

سنگترے۔

چڑھاتیا!

میں نے سوچا اس لاری کے اڈہ پر تو بڑا مزہ ہے۔ یہاں سب

تا ہے۔ چائے، سنگترے، مذہب سب کچھ بکتا ہے۔ اور

ہ میں کمیشن بھی ملتا ہے۔ میں نے فلپس سے پوچھا، بھئی اگر

ی سی چائے لے لیں اور رسا مذہب اور سنگترے کے

ں مکس ( ) کر کے ہلایا جائے تو یہ کیسی کاک ٹیل

ہے گی۔

فلپس نے ناک چڑھا کے کہا۔ اوہ ہول، بڑی بد بو دار

ں، خالی سنگترے لے لو۔ . . . .

جب ہم لوگ بہت سے سنگترے کھا چکے تو فلپس نے

کہا۔ یہ ایک سنگترہ باقی رہ گیا ہے۔ اسے رہنے دو۔

کیوں؟

آگے چل کے بتائیں گے۔

ابھی کیوں نہ بتاؤ

ابھی موقع نہیں ہے۔

اس میں موقع کا کیا سوال ہے۔

بچوں کی طرح ضد نہیں کرتے۔ آگے چلو بتائیں گے۔

آگے چل کے دو تین جگہ جہاں جہاں لاری رکی میں پوچھت

"یہاں بتاؤ گے"۔ وہ ہنس کے کہتا۔

"نہیں آگے بتائیں گے۔ اسی طرح کرتے کرتے ہم لوگ ا

کے قریب پہنچ گئے کوئی چار یا پانچ میل انعرالیی کے قریب

گاؤں کے پاس ایک آدمی نے ہات دیا۔ گاڑی رک گئی فلپس

مجھے اترنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں اور فلپس دونوں نیچ

اتر گئے میں نے دیکھا کہ فلپس کے ہاتھ میں ایک سنگترہ ہے۔

سڑک پر کھڑے رہنے والے نوجوان کے ہات میں بھی ایک سنگ

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور نوجوان نے

اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اچھا تو یہ سگنل تھا۔ میں نے فلپس سے پوچھا۔

فلپس مسکرا دیا۔

مگر تم نے یہ سگنل کا سبب دریافت کیسے کیا۔ کیا اس گاؤں میں
ہے۔ یہاں سے کوئی لون تو بہت دور ہے۔

نارڈاک تو کچھ نہیں ہے۔ فلپس نے جواب دیا۔

پھر؟

وہ میری طرف دیکھ کر عجیب انداز سے مسکرایا۔ بولا۔ بس
ام ہوجاتا ہے زیادہ پوچھ کر کیا کرو گے۔ یہ بھی ٹھیک ہے
نے کہا۔ اب آگے چلو۔ کہاں چلتے ہو آگے شاید ایک آدمی
کاہن کے ہاتھ میں اتار ہوگا۔ پھر وہاں سے ہم بائیں طرف
میں گے۔ جہاں ایک آدمی گلی کا معمہ لئے کھڑا ہوگا۔ پھر
سے ہم دائیں طرف کو جائیں گے جہاں ایک آدمی انگوروں
بھا لئے کھڑا ہوگا۔ پھر وہاں سے سیدھے منزل مقصود کی
ت بڑھ جائیں گے۔ جہاں ایک آدمی تیر لئے کھڑا ہوگا۔

فلپس ہنسنے لگا۔ بولا۔ تم رومانٹک کہانی واقعی اچھی لکھ
تے ہوگے۔ مگر یہاں رومانس کی بات نہیں ہے۔ سخت
ضروری تھی۔ جس جگہ ہم جا رہے ہیں۔ وہاں مسمر کا دنی مقتابہ
دہشت ہے کہ بہت سنبھل کے کام کرنا پڑتا ہے اور
انہیں کچھ بھی بھنک پڑ گئی کہ تم یہاں کسی تحقیقات یا ایسی
کے سلسلہ میں آئے ہو تو سیدھے دھر لئے
جاؤ گے، اور تمہاری حفاظت کے لئے میں نے پہنچ کر کسی قیادہ

اس لیئے اب چپکے سے میرے ساتھ چلے آؤ۔

اس کے بعد ہم چپ چاپ وہاں سے روانہ ہوئے ر
میں ناریل کے ریشے بننے والی فیکٹری ملی۔ جو کھلی پڑی تھی۔ ا
جس کی کھڈیوں پر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ چاروں طرف نا
کے درخت تھے۔ اور ریشے بننے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھ
مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہاں اب بہت عرصے تک اُن
کھڈیوں پر کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ ہمارا رہبر ہمیں آگے ہی آگے دو
کے کھیتوں کے بیچ ایک تنگ رستے پر چلاتا ہوا لیجا رہا تھا۔ آگے
جاکے ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ یہاں ایک گھر تھا۔ ایک
گھر کے آگے دو عورتیں ناریل کے درختوں کے ریشے بن رہی تھیں ایک
عورت اور ایک لڑکا ناریل کے ریشوں کو پتلے سوت میں تبدیل
کر رہے تھے۔ اور دو عورتیں چرخہ چلا رہی تھیں۔ ایک آدمی ناریل کے
تنے سے لگا کھڑا ہماری راہ دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں
بھی ایک سنگترہ تھا۔

وہاں سے ہم پھر آگے چلے، یہاں دھان کے کھیت ختم ہو
گئے تھے۔ اور اب پتلی سفید ریت شروع ہو گئی تھی۔ جو ناریل کے
جھنڈوں کے بیچ بیچ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے موزے
اور جوتے اتار لیئے اور نرم و ملائم گدگدانے والی ریت پر
لگا۔ آگے جاکے پانی کی ایک نہر آئی جس پر ایک ناریل کا ملتا تنا

پڑا ہوا تھا۔ یہ تنا بہت تیلا تھا۔ اور ذرا اونچا بھی تھا۔ ہمارا رہبر بڑے آرام سے چلتا ہوا اس پر سے گذر گیا۔

میں نے پتلون اتار لی

کیا کرتے ہو! فلپس بولا۔

میں نے کہا۔ مجھے سرکس کے رسے پر چلنے کی عادت نہیں میں اس پل پر سے نہیں پانی کے بیچ سے ہو کے جاؤں گا۔ پانی کی نہر جسے یہاں تولا کہتے ہیں۔ نیم گرم خنک اور بڑی ملائم تھی نرم نرم ریت پر پاؤں ایسے پڑتے تھے۔ جیسے دبیز غالیچے میں بڑے سکون اطمینان سے آہستہ آہستہ نہر کے پانی پانی کو کاٹتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اور پھر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ رہبر نے فلپس سے کچھ کہا اور فلپس مجھ سے کہا آگے بھی دو تین اور ایسے ہی تولے آئیں گے۔ اس لئے پتلون اگر تم کندھے پر ڈال لو تو اچھا ہے، میں نے پتلون کندھے پر ڈال لی۔ اور وہ دونوں پھر ہنسنے لگے۔ آگے جا کے دو آدمی اور مل گئے۔ رہبروں نے کندھوں پر پتلون ڈالے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ لوگ اس کی طرف دیکھ کے مسکرائے

آگے جا کے پھر دھان کے چھوٹے سے کھیت دکھائی دیئے دور آبادی کے آثار، یہاں پر ایک جگہ ناگ پھنی کی بہت سی جھاڑیاں تھیں، یہاں پر پھر ایک آدمی ہماری راہ دیکھ رہا تھا۔ رہبر اس کے پاس چلا گیا۔ اس آدمی نے رہبر سے کچھ کہا، رہبر نے فلپس سے

کچھ کہا۔ اور فلپس نے مجھ سے کہا۔ سب ٹھیک ہے کوئی خطرہ نہیں ہے

تو میں پتلون پہن لوں؟ میں نے پوچھا۔

سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے

تاک مینی کی جھاڑیوں کے قریب سے گزر کر ہم ایک اونچے کھیت سے آگے نکل کر نشیب میں چلے گئے۔ جہاں بہت سے ناریل کے جھنڈ تھے۔ اور ان کے بیچ میں ایک کھلی سی جگہ تھی۔ جہاں ایک ٹیڑھا مکان کھڑا تھا جس پر ایک اولم کا پیڑ تھا۔ اور پچیس کا جس کے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک پتھر میں ناریل کی کولی گڑی ہوئی تھی۔ کولی کے چاروں طرف کرنک پائیل کی سرخ پتیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

چاروں طرف سناٹا اور ویرانی تھی۔

فلپس نے مجھ سے کہا۔ یہ پنیا پالہ ہے

پنیا پالہ گاؤں جہاں سرسی پی کی مطلق العنانی کو ختم کرنے کے لئے کیرالا کے عوام نے اپنا پہلا مورچہ باندھا تھا۔ وہ سرسی پی ٹراونکور کو برطانوی کامن ویلتھ کے اندر ہندوستان سے الگ ایک خودمختار حکومت کا درجہ دینا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اپنی ڈکٹیٹرشاہی ہمیشہ کے لئے قائم رکھ سکے۔ اس کے خلاف یہاں عوام نے پہلا جارحانہ اقدام کیا تو یہاں سامنے کے ویران گھر میں اس کے سپاہی تھے۔ اور ان کے

چاروں طرف پناپارا گاؤں کے کسان اور پیٹھے بننے والی فیکٹریوں کے مزدور رہائش میں کام کرتے ہیں۔ ان کی رہنمائی میں یہ مورچہ یہاں باندھا گیا تھا۔ سی۔ پی کے تیس چالیس سپاہی ہلاک ہوئے تھے اور تقریباً اتنے ہی پناپارا کے کسان اور مزدور ...... اسی مورچہ کی گونج چاروں طرف پھیل گئی۔ اور ٹرانکور کی کانگریس نے بھی اس تحریک کا ساتھ دیا۔ پھر دوسرا مورچہ اسی جگہ گرم ہوا۔ امر سی۔ پی کے حکم سے چاروں طرف سے اس گاؤں کو گھیر لیا گیا۔ اور باہر نکلنے والے رستہ پر مشین گنیں نصب کر دی گئیں۔ اور اس دن میں اس گاؤں کے اور آس پاس کے پچاس ساٹھ مزدور اور کسان شہید ہوئے۔ پھر یہاں کے کئی گھر جلا دیئے گئے اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کیونکہ مطلق العنانی ـــ اور جاگیرداری کی اپنی کوئی حرمت نہیں ہوتی۔ وہ دوسرے کی حرمت پر جیتی ہے۔ اور دوسرے کا لہو چوس کر خود کو زندہ رکھتی ہے۔

رہبر نے کہا۔ اس روز جہازجہ کا ہشتم دن تھا۔ پولیس اس کانگریسی کے گھر رہی تھی۔

کیا کانگریسی نے پولیس کو پناہ دی تھی۔

نہیں۔ اس وقت تو وہ لوگ بھی ہوا سے ساتھ تھے۔ یہ مکان تو پولیس نے زبردستی خالی کروا لیا تھا۔

اب اس مکان میں کوئی نہیں رہتا ہے۔

اب اس مکان میں کون رہے گا۔ وہ بولا۔
میں نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔
منگاپن
کیا تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟
ہاں۔
کون جات ہو؟
"ایراوس" اس نے بڑے فخر سے کہا، ہماری جات سب سے نیچی ہے۔ اور سب سے زیادہ وشتھید ہماری جات کے تھے کچھ نام بتاؤ۔
کیشو، تھامس۔ فرانسیس.......
میں نے فلپس کی طرف دیکھا، فلپس نے کہا یہ گاؤں عیسائیوں کا ہے عیسائیوں کی کثرت ہے یہاں آزادی کی لڑائی میں اور مزدور تحریک میں غریب عیسائی عوام نے کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔
مزدوروں کی ایک جات ہوتی ہے۔ دوسرے کر ریمر نے کہا۔
میں نے ریت سے اٹھ کے کہا۔ چلو آگے چلیں، ہم لوگ ناریل کے درختوں سے ہوتے ہوئے آگے چلنے لگے۔ یہ ناریل کے تنوں پہ بندوق کی گولیوں کے نشان تھے۔ آگے نکلے تو ایک گھر ملا جس کے باہر ایک بڑھیا ناریل کا سوت کات رہی تھی۔

رہبر نے کہا ۔ اس کی لڑکی میری جیل میں ہے۔

کیوں؟

مزدوروں کی تحریک میں حصہ لیتی ہے اور اب تو پنا پالا کی تحریک کو بھی مزدوروں کی تحریک کہا جاتا ہے ۔ اسی لئے تو کانگرس نے حکومت حاصل کرتے ہی اپنے وہ سب وعدے بھلا دیئے جو انھوں نے پنا پالا کے سلسلہ میں گرفتار کئے ہوئے ساتھیوں کی رہائی کے متعلق کئے تھے ۔ وہ لوگ ابھی تک جیل میں ہیں ۔

مانی ہماری طرف دیکھ کے مسکرائی ۔ بات کے اشارہ سے ہمیں بلا کے کہنے لگی ۔ میں نے اپنے مہمان کے لئے ایک ناریل رکھا ہے انھیں کھلاؤں گا ــــــــــ یہ صرف مہمان کے لئے ہے اور کسی کے لئے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مانی نے ناریل توڑ کے مجھے دیا ۔ میں اور نلیس اس میں سے باری باری پانی پینے لگے ۔ مانی تنگاپن کے سر پر ہاتھ پھیرتی جاتی تھی ۔ اور ہماری طرف مسکراتی جاتی تھی ۔

جہاں پر پنا پالا گاؤں ختم ہوتا ہے ۔ وہاں پر درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ تھا جس کے اوپر ایک سبز جھنڈا لہرا رہا تھا ۔ اس کے قریب ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے کنارے پر ایک گھر گرا پڑا تھا ۔ صرف دروازہ صحیح سلامت تھا ۔ گھر کے چاروں طرف کی باڑھ ٹوٹی پڑی تھی اور اس میں جگہ جگہ سے جھاڑیاں اُگ آئی تھیں تالاب میں کاسنی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے ۔ تالاب سے گھوم کے ہم ادا سنتہ

ایسی کو جاناتھا۔ اس رستہ پہ سے ایک نوجوان لڑکی ہماری طرف آ رہی تھی۔

رہبر نے کہا۔ یہ مناکشی ہے۔

کون مناکشی؟ میں نے پوچھا

رہبر کچھ کہنے کو تھا؟ لیکن لڑکی اب بہت قریب آ گئی تھی۔ وہ لڑکی ایک عجیب محویت کے عالم میں ہمارے قریب سے گذر گئی اور درختوں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی۔ جہاں املی اور انجی کے درخت تھے۔ اور ان پہ آل اور اوڈا کی ہری ہری بیلیں دور تک چڑھتی چلی گئیں وہاں جاکے وہ لڑکی دیر تک کھڑی رہی، پہلے اور دیکھتی رہی جہاں سفید جھنڈا تھا۔ پھر اس کی پلکیں نیچے جھک گئیں۔ اور اس نے زمین پر سے چند سفید انجی کے پھول اٹھا لئے اور انہیں انجی کے درخت کی کھو میں ڈال دیا۔ اور پھر ہات جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

یہ کیا کرتی ہے؟ میں نے پوچھا۔

رہبر نے آہستہ سے کہا۔ یہ ہمارے گاؤں کا گاڈ ہے گاڈ ایک مقدس جھنڈا ہوتا ہے۔ جہاں گاؤں والے آکے منت مانتے ہیں۔ یہاں بہت سانپ بھی رہتے ہیں، ایک دن مناکشی اور نیرو تھی نے اس جگہ آ کے گاڈ کے سامنے اقرار کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے شادی کریں گے۔

نیرو میں کون تھا۔؟

وہ ہمارا شہید ہے۔ پتا پارا کی لڑائی میں شہید ہوا تھا۔ اور سامنے کے گھر میں رہتا تھا۔ اس کا گھر بعد میں گرا دیا گیا آج یہاں کوئی نہیں رہتا۔

مناکشی کے ہاتھ آہستہ سے نیچے گر گئے۔ وہ آہستہ سے مڑی اور پیتروس کے گھر کی جانب چلی گئی۔ اور دروازے سے لگ کے اس طرح کھڑی ہو گئی۔ جیسے کوئی اپنے آپ کو محبوب کی آغوش میں ڈال دے۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ اب یہ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔
رہبر نے بڑی مشکل سے کہا۔ اب یہ ہر روز پیتروس سے کہنے آتی ہے کہ تیری مناکشی کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

نیا پارا سے ہو کے ہم لوگ ایپی چلے گئے۔ جو اس گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر ہوگا۔ یہاں طالب علموں نے ایک جلسہ کیا تھا جلسے کے صدر صاحب نے میرا تعارف حاضرین سے کرایا۔ بڑے دلچسپ تھیوسوفسٹ تھے، آپ نے اپنی تعارف تقریر میں میرے متعلق کہا کہ میں ایک ترقی پسند ادیب ہوں۔ اور اشتراکی عمل، اور فلسفے میں یقین رکھتا ہوں، ترقی پسندی بہت اچھی چیز ہے۔

لیکن گاندھی ازم بھی برا نہیں۔

• انسانی اشتراکیت کا بھلا سوچتے ہیں۔

لیکن مذہب بھی یہی سوچتا ہے۔

اشتراکی خدا کو نہیں مانتے۔

لیکن وہ ان بڑے لوگوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ جو خدا کو مانتے ہیں اور
ہیں خدا کو نہیں مانتے۔

خدا کیا ہے؟

خدا ہمارے اندر ہے

وہ سب کے اندر ہے

نیکی یا برائی اضافی چیزیں ہیں ایک چیز کے دو پہلو۔ نیک سے نیک آدمی کے اندر بھی
ئی چھپی رہتی ہے اور بُرے سے بُرے انسان کے اندر بھی نیکی دبی رہتی ہے۔

(یعنی سرمایہ دار بھی نیک ہو سکتا ہے)

اسلئے کون کسی کو سزا دے سکتا ہے (چور بازار)

اس لئے کسی کو سزا نہیں ملنی چاہیئے (سرمایہ دار کو چھٹی دو)

صرف اپنا آپ سدھارو (اور سماج کو اسکے حال پر چھوڑ دو)

اپنا آپ سدھارنے میں انسانیت کا نروان ہے نروان۔ ترقی نہیں

نروان یعنی زندگی سے چھوٹنا۔ زندگی
میں ترقی کرنا نہیں)

بچپن میں میں پرانے مذہب پرستوں سے اس قسم کی تقریریں سنا کرتا تھا۔ برسوں
سوں کے بعد ایسی دلچسپ تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ جسکا ہر پہلا فقرہ دوسرے کی کاٹ
رتا تھا۔ صاحب موصوف ابھی کچھ کہہ رہے تھے۔ جھٹ پہلو بدل کر اس کی
لعنت کر دیتے۔ ایسی شاندار قلابازی میں نے امپیریل سرکس میں بھی نہیں

دیکھی تھی۔ جانے سٹوڈنٹ فیڈریشن والوں نے ان حضرات کو کیا سمجھ
یہاں جلسے میں بلا لیا تھا۔ جلسے کے بعد جب جائے کی باری آئی تو ان
دلچسپ باتیں ہوئیں۔ اب کے ان کے ساتھ ایک اور صاحب مل گئے
کا سر گھٹا ہوا تھا، اور سر پر ایک گول ٹوپی رکھے تھے۔

تھیوسوفسٹ   اس ملک کو جناح نے برباد کیا۔ ورنہ یہ ملک ہرگز
تقسیم نہ ہوتا۔

گول ٹوپی   بالکل ٹھیک!

میں   جناح سے پہلے اس ملک میں منو موجود تھا۔

تھیوسوفسٹ   منو نے سماج کو پیشوں کے اعتبار سے بانٹ دیا۔ ا
میں کوئی برائی نہیں تھی۔ برائی جب پیدا ہوئی جب مس
آئے اپنے کلچر کو بچانے کے لئے یہاں کے ہندوؤں
ذات کے رواج کو شدید اور سخت کر دیا۔

گول ٹوپی   بالکل ٹھیک

میں   مسلمانوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کیا ضرورت تھی،
تو سب انسانوں کو ایک مانتے ہیں۔

تھیوسوفسٹ   میں اس وقت ایک سیاسی بات کر رہا ہوں سیاسی ا
سے مسلم لیگ مجرم ہے اسی نے ملک کو تقسیم کیا۔

میں   تقسیم کے سمجھوتہ پر کانگریس اور لیگ دونوں
دستخط ہیں۔

تھیوسوفسٹ وہ الگ بات ہے۔ دراصل ہندوؤں میں حفاظت کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ اس کے کلچر میں بھی مخالف اجزا کو سمو لینے کی بڑی قوت ہے۔

میں گذشتہ فسادوں میں اس کا مظاہرہ نہیں ہوا۔

تھیوسوفسٹ لیگ ہی مجرم ہے۔ آپ صاف صاف حقیقت کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندؤں نے ملک کو تقسیم کیا۔

میں میں نے یہ تو کبھی کہا ہی نہیں۔ میں نے تو ہندو اور مسلمان عوام کا نام بھی نہیں لیا۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جس سمجھوتہ کی رو سے یہ ملک تقسیم ہوا اس پر کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں اور برطانوی سامراج کے نمائندوں کے دستخط ہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر جمہوریت واقعی کسی چڑیا کا نام ہے تو اتنا بڑا ملک تقسیم ہوا۔ اس سے پہلے اگر عوام سے پوچھ لیا جاتا کہ بھئی تمہیں اس تقسیم کے متعلق کیا کہنا ہے تو کوئی نہ ہوتی۔ اس کے بعد چاہے وہی ہوتا جو اب ہوا........

تھیوسوفسٹ ہونا وہی تھا جو اب ہوا۔ یہ تقسیم لازمی تھی۔

میں لازمی تھی تو پھر مسلم لیگ کیوں مجرم بنے اور لاکھوں کروڑوں انسان کیوں گھر سے بے گھر بنے۔ اور موت

کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

تھیوسوفسٹ — یہ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ایک انسان کے خون میں سماج کا
بھلا ہوتا ہو تو اس انسان کی قربانی دینی چاہیے۔ اگر ایک
صوبہ کی قربانی سے پورے ملک کا بھلا ہوتا ہو تو اس
صوبہ کو قربان کر دینا چاہیے۔ اگر ایک ملک کی قربا
سے ساری دنیا کا بھلا ہوتا ہو تو اس ملک کو قربان کر د
چاہیے۔

گول ٹوپی — بالکل ٹھیک!

میں — یہ بالکل پرانے مذہب پرستوں کی قربانی والا فلسفہ ہے
ایک انسان کے خون پینے سے دوسرے انسان کا بھلا
ہو سکتا ہے۔ یا ایک چھوٹے ملک اور قوم کا گلا کاٹ د
سے اگر زیادہ قوموں یا ملکوں کا بھلا ہوتا ہو تو اسے جا
سمجھنا چاہیے۔ میں اسے تھیوسوفی نہیں کہوں گا۔ ہٹلر یہ
کہوں گا۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی قوم کا حق سلب کرنے
سے بھی دنیا کے امن پہ چوٹ لگتی ہے۔ اور اس
اجتماعی کلچر کو صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ بٹوارہ امیر لوگوں
کا بٹوارہ ہے۔ عوام کا بٹوارہ نہیں ہے۔ ورنہ اتنا
خراب نہ ہوتا۔

تھیوسوفسٹ — جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو درد بڑھتا ہے۔ درد اور

ہی تخلیق کی قیمت ہے۔

میں — میں کھیتوں میں کام کرنے والی ایسی ہزاروں ماؤں کو جانتا ہوں جو بچہ پیدا ہونے کے دوسرے دن ہی پھر اپنے گھر بار کے کام میں لگ جاتی ہیں۔ لیکن آپ کے خیال میں شاید تخلیق نرسنگ ہوم ہی میں ممکن ہے۔

گول ٹوپی — صاحب بٹوارہ بالکل ضروری تھا۔ ورنہ ملک میں کبھی امن چین نہ ہوتا

میں — آج کیا ملک میں امن چین ہے

گول ٹوپی — تو کیا آپ بٹوارہ کے خلاف ہیں۔

میں — میں نے بٹوارے کے حق میں یا مخالفت میں کچھ نہیں کہا پہلے آپ خلاف بول رہے تھے۔ اور مسلم لیگ کو مجرم ٹھہرا رہے تھے۔ اب آپ بٹوارے کی طرف داری کرنے لگے۔ میرے خیال میں یہی آپ کا صحیح جذبہ ہے۔

گول ٹوپی — نہیں میں بٹوارے کے خلاف ہوں۔ تھا۔ مگر اب نہیں ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان الگ الگ آزاد رہ سکے آرام اور سکون سے رہیں مگر جب تک پاکستان کی پالیسی نہیں بدلتی ایسا ناممکن ہے۔

میں — اس لئے جنگ ناگزیر ہے۔

تھیوسوفسٹ کہہ نہیں سکتے۔ خدا کے دستور نرالے ہیں اور پر اسرار ہیں آپ کا کیا خیال ہے

میں معرفت کے رموز سے میں آگاہ نہیں۔ زمینی بات کہتا ہوں۔ جہاں کا میں رہنے والا ہوں۔ اسے ایک زمانے میں پنجاب کہتے تھے۔ یہ ملک ہری پور ہزارے سے انبالے تک۔ اور راولپنڈی سے ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پانچ دریا بہتے تھے۔ اس ملک کے نوے فیصدی لوگ کسان تھے۔ جن کی ایک زبان تھی۔ ایک لباس تھا۔ زندگی کے رہن سہن کے رسم و رواج ایک جیسے تھے۔ ان میں قومیت کی بہت سی باتیں مشترک تھیں، جن میں ابھار، اور مضبوط کیا جا سکتا تھا۔ لیکن خود غرض لوگوں نے ایسا نہیں کیا ——— انہوں نے ہمیشہ مختلف مذہبی عناصر کو ایک دوسرے سے لڑوانے کی کوشش کی جو کسی قوم کے شیرازے کو بکھیرتے ہیں۔ جمع نہیں کرتے۔ یہ کوشش کئی سالوں سے جاری تھی۔ اس میں سب سے بڑی قوت برطانوی سامراج کی تھی۔ اس کے پٹھو ہندو مسلمان اور سکھ سرمایہ دار اور زمیندار تھے اور ان کی پشت پناہی دوسرے صوبوں کے سرمایہ دار بھی کر رہے تھے۔ جن میں گجراتی اور مارواڑی سرمایہ

اور یوپی کے مسلمان امرا کا طبقہ پیش پیش تھا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کو ایک لمحے کے لئے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ پنجاب کے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح تقسیم کر دے۔ ان کے ملک کو ایک چھوٹی موٹی زمینداری کی طرح اپنے بیٹوں میں بانٹ دے۔ پنجاب کی قسمت کا فیصلہ اس کے بیٹے کرتے۔ پھر چاہے وہ اپنے ملک کے ایک کے بجائے تین یا چار حصے کر دیتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک ہو کے رہتے یا ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ ان تمام باتوں کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق صرف پنجاب کے عوام کو پہنچتا تھا۔ لیکن دانستہ طور پر اور جان بوجھ کر انہیں یہ حق نہیں دیا گیا انہیں نہ کانگریس نے دیا نہ مسلم لیگ نے نہ برطانوی سرکار نے۔ کیوں کہ میرے خیال میں ایسا کرنا اس کے اپنے مفاد کے خلاف تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بٹوارے کے بعد ان لوگوں کے مفاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ نقصان پہنچا تو پنجاب کے عوام کو، ان کے گھر لوٹے گئے۔ جائدادیں تباہ ہوئیں، زمینیں چھینی گئیں۔ عورتوں کی حرمت برباد ہوئی۔ اور بچوں کے گلے کاٹے گئے۔ ان مصائب میں ہندو اور مسلمان اور سکھ برابر کے شریک ہے

یعنی یہ خون پورے پنجاب کی نس نس رگ سے بہایا گیا
لیکن جو امیر سکھوں کا طبقہ وہاں تھا۔ وہ مشرقی پنجاب
آکے بھی اسی طرح امیر کبیر رہا۔ جو لوگ ادھر زمیند
اور جاگیردار تھے وہاں جاکے بھی زمیندار اور جاگیرد
رہے۔ یعنی اپنے طبقے کے مفاد کو ہر حالت میں محفوظ
گیا پہلے سے بہتر بنالیا گیا۔ کئی حالتوں میں اور زیا
مضبوط اور شدت سے عوام کے گرد شکنجہ کس دیا گیا
اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ عوامی قوتیں استحصالی ق
کے مقابلہ میں کمزور تھیں۔ اس لئے شکست کھا گئیں
پنجاب میں ہوا۔ وہی بنگال میں اب ہو رہا ہے۔ وہی
ہندوستان کے اور پاکستان کے ہر صوبے میں ہ
ہے۔

گولڈ سپنی تھیوسوفسٹ
(مشتری آگے بڑھا کے) فی الحال مٹھائی کھائیے۔
(آہ بھر کے) انسان کی کشمکش دائمی ہے۔ اسے کہ
طور قرار حاصل نہیں۔ وہ ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔
ترقی کرتا رہتا ہے۔ مگر ترقی کیا ہے۔ ترقی خوشی ہے
کیا اشوک کے زمانے کا انسان اکبر کے زمانے کے انس
سے کم خوش تھا۔ کیا چھکڑا چلانے والا گاڑی بان
ہوائی جہاز چلانے والے سے زیادہ خوش نہیں۔

میں پوچھتا ہوں ——— !

گول ٹیپی   بالکل ٹھیک !

میں   کیا بندر انسان سے زیادہ خوش نہیں ——— ؟

جو بحث میں نے اوپر درج کی ہے ممکن ہے اس کی صحت میں جزوی طور پر کچھ اختلاف ہو ممکن ہے میں نے اپنا یا کسی دوسرے صاحب کا کوئی خیال یا جذبہ غلط ظاہر کیا مگر جو گفتگو ہوئی اس کا لب لباب یہی تھا۔ اس کا پورا رجحان اور تاثر یہی تھا اور غالباً اس کی نوعیت اور ترتیب بھی اسی طرح کی تھی۔

الوائی کیرلا کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے، اور ناریل کے ریشوں سے سامان تیار کرنے والے کارخانوں کا مرکز ہے۔ اس کی بڑی بڑی سڑکوں سے گزرتے ہوئے جو بڑے بڑے کارخانے نظر پڑتے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

(۱) پیئرس لیزلی اینڈ کمپنی
(۲) وال کارٹ برادرز
(۳) جیمپن نال اینڈ کمپنی
(۴) ویرز سینل اینڈ کمپنی
(۵) گوڈ ایرن اینڈ کمپنی

کون کہتا ہے کہ انگریز یہاں سے چلے گئے ہیں۔ ممکن ہے ہماری پارلیمنٹ

یں ان کی ضرورت نظر نہ آتی ہو لیکن جہاں تک ناریل کے ریشوں کی صنعت کا لق ہے۔ جہاں تک جوٹ کی صنعت کا تعلق ہے۔ جہاں تک چائے کی صنعت تعلق ہے۔ جہاں تک تمباکو کی صنعت کا تعلق ہے۔ جہاں تک ـــــ لیکن کوئی ہاں تک گنوائے، صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ جہاں تک کا جہاں تک تعلق ہے ۔ ابھی تک یہیں موجود ہیں۔

ایسی کی کھڑکیاں، خوشنما چوک اور ایک ہی وضع کے بنے ہوئے مکان ظاہر کرتے ہیں کہ یہ شہر ایک پلان کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے۔ اس شہر کو یوان کیشور داس نے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے تعمیر کیا تھا۔ اسے جنوبی ہند کا وینس کہا جاتا ہے۔ وینس کی طرح یہاں بھی شہر کے بیچ میں سمندر کی نہریں بہتی ہیں۔ جن میں اکثر کشتیاں سفر کرتی ہیں۔ اور مال و اسباب لے جاتی ہیں۔ جگہ جگہ جیٹی دکھائی دیتی ہے۔ اور دخانی کشتیاں پھٹ پھٹ کرتی ہیں کشتیاں جاتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ مسافر اترتے رہتے ہیں۔ بوٹ میں سوار ہو رہے ہیں۔ طرح بادبان پھیلاتے ہوئے یا سمیٹے رہتے ہیں۔ عورتیں کشتی کے جنگلے سے لگی بچوں کو دودھ پلا رہی ہیں۔ واٹر فرنٹ کے کنارے کیلوں کے گچھے اور سنگترے نشر تے ہیں۔ دلال کالی مرچ کا بھاؤ طے کر رہے ہیں، اور بڑے بڑے ڈونگوں کے لمبے لمبے چپوؤں سے کھینچے ہوئے ناریل کے سوت کے گٹھوں کو کارخانے سیڑھیوں تک لا رہے ہیں۔ ان ملاحوں نے جو دخانی کشتیوں پر کام کرتے ہیں۔ بات کے چپو چلاتے ہیں۔ اپنی کل ٹراونکور کوچین لال یونین بنا رکھی ہے۔ جو ڈی مضبوط اور لڑاکا ہے۔ اسی طرح ریشے بننے والے مزدوروں اور ناریل

کے سوت کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بھی لال یونین ہے جس کے صدر ساتھی ٹی وی تھامس ہیں۔ اس یونین کے ممبر ستر ہزار سے اوپر ہوں گے۔ اس انجمن کا شمار جنوبی ہند کی مضبوط ترین انجمنوں میں ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بالعموم ملوں کے منیجر بھی اگر نئے مزدور بھرتی کریں تو اسی یونین سے لیتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تجربہ سے دیکھ لیا ہے کہ سرمایہ داروں کی حمایتی یونین کا کوئی آدمی بھی زیادہ دن کارخانے میں ٹکنے نہیں پاتا۔ اسی طرح الپی میں بیڑی بنانے والے مزدوروں کی یونین ہے اور ان تمام یونینوں کے اندر دو ڈھائی لاکھ مزدور متحد ہیں۔ شاید اسی وجہ سے الپی کو جنوبی ہند کی مزدور تحریک کا لال قلعہ کہا جاتا ہے۔

جن دنوں میں الپی میں تھا۔ ان دنوں مزدور تحریک کو بڑی سختی سے دبایا جا رہا تھا۔ دو ماہ پہلے یعنی ۲۶ اکتوبر کو وائیلور کے شہیدوں کی یاد میں مزدوروں نے دن منایا تھا۔ اس روز بھی پولیس نے گولی چلائی تھی جس سے ایک ساتھی مدیتیا ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کے بعد گذشتہ نومبر کو مزدوروں نے پھر شہر بھر میں مشعلیں لے کے ایک جلوس نکالا تھا۔ جسے پھر زبردستی منتشر کر دیا گیا۔ قانون سے نہیں بلکہ سلطانی دباؤ ڈال کر مرکزی ٹریڈ

یونین کا دفتر بند کر دیا گیا۔ اور جب میں وہاں پہنچا تو بند ہی تھا۔ لیکن میری آمد پر مزدوروں نے اسے کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔ گو پولیس کا دباؤ اسی شدت اور نوعیت کا تھا۔ اور پولیس کا تھانہ بھی ٹریڈ یونین کے دفتر کے بالکل سامنے تھا۔ یہاں تھانے کے قریب ہی چند دن پہلے ڈاکٹر کی دکان کے سامنے ایک ٹریڈ یونین ورکر کو گولی مار دی گئی تھی۔ لیکن اسی تشدد کا سامنا کرتے ہوئے مزدوروں نے آج کے دن پھر سے اپنی یونین کا دفتر کھولا۔ اس موقع پر بھی کوئی پانچ سو کے قریب ٹریڈ یونین کے ممبر جمع ہو گئے تھے۔ اور اپنے انقلابی عزم کا اظہار کر رہے تھے۔

یونین کے دفتر سے باہر نکل کے مزدور مجھے سامنے کی سڑک پر لے گئے یہاں تھانے کے قریب چند دن پہلے ان کے ایک سرگرم ساتھی کو پولیس کی گولی کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ میں وہ جگہ دیکھ رہا تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ بازار کی اکثر دکانیں بند پڑی تھیں۔ اور کھلی سڑک پر ہمارے سوا اور کوئی چلتا نظر نہ آتا تھا۔ اور تھانے کے برآمدے میں پولیس کے لوگ کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور کوئی اکا دکا راہ گیر سہمی ہوئی ہراساں نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا جلدی سے بڑی سڑک کو چھوڑ کے آس پاس کی کسی تنگ گلی میں گھس جاتا۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے شوالکوٹا پالم کی جانب بڑھتے گئے۔ اور یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے میں بظاہر بہت ہی غیر شعوری طور پر پچیس پچاس سالہ آدمیوں کے نرغے میں ہوں۔ جیسے میرے آگے پیچھے ادھر ادھر ہٹ کے مزدور بظاہر اپنی اپنی باتوں میں مصروف چل رہے ہیں۔ لیکن

دراصل وہ سب لوگ مجھے اپنی حفاظت میں لیئے چل رہے تھے۔ شوا کوٹا پایا تک یعنی جہاں تک خطرہ کا امکان زیادہ تھا۔ میرے ساتھ مزدوروں کا جماعت بھی زیادہ تھی۔ پالم پار کر کے میرے اسٹ گرد لوگ چھنٹے گئے۔ آگے چل کے دس پندرہ رہ گئے۔ اور جب ہم لوگ اپنے ہوٹل پہنچے تو اور فلپس اور دو آدمی اور رہ گئے تھے۔ اب یکایک مجھے یاد آیا کہ ان بیس بائیس دنوں میں مجھے ایک دن بھی ایک لمحے کے لیئے اکیلا نہیں چھوڑا گیا۔ ایک دفعہ میں رات کے دو بجے باتھ روم جانے کی نیت سے اٹھا۔ اور کمرہ کا دروازہ کھول کے آگے بڑھا تو کسی نے کہا۔ آپ کو باتھ روم جانا ہے۔ آپ کو رستہ بتادوں۔ پھر وہ ساتھی ہاتھ میں پانی کا لوٹا لیئے میرے آگے آگے چلنے لگا۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے ساتھیوں کی سیاسیانہ نظم کی داد دینے لگا۔ جس انقلابی شعور، عزم اور باقاعدگی کا تجربہ مجھے کیرلا میں ہوا۔ وہ میں نے شمالی ہند میں بہت کم جگہوں میں پایا ہے۔ اور یہ شے لطیفہ ہے جس پر کیرالا کے ... بطور ... فخر کر سکتے ہیں۔

MANSOOR BROTHERS.
No.........................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.

شام کے وقت ہم لوگ گھومنے کے لیئے نکلے۔ پہلے خیال تھا ہم لوگ سمندر کے کنارے چہل قدمی کرنے جائیں گے۔ کیونکہ آج فلپس اداس تھا۔

کرسمس کا دن تھا۔ اور یہاں اپنی سے بہت دور کسی پہاڑی وادی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس کی بیوی اس کی راہ تک رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم دونوں سمندر کے ساحل پر ریت میں ننگے پاؤں گھومتے ہوئے کف آلود لہروں پر ابھرتے ہوئے چاند کو دیکھیں گے۔

لیکن ہوٹل سے نکلتے ہی نلیپس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ بولا۔ چلو تمہیں وہ بازار دکھاؤں جہاں سے ہم نے اپنا مشعلوں کا جلوس نکالا تھا۔ اور جس سلسلے میں کامریڈ ممدیتا شہید ہوا تھا۔

میں نے کہا — بہت اچھا ——— پھر وہاں سے سمندر کے کنارے چلیں گے۔

وہ بازار ایسا ہی تھا۔ جیسے دوسرے بازار ہوتے ہیں۔ اس کے چوک میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ جس پر بجلی کے ہزاروں قمقمے لگے ہوئے تھے۔ اور جس کے دالانوں اور دالان کے ستونوں کے ارد گرد پھولوں کے ہزار ہا ہار لپیٹے ہوئے تھے اور گھنٹے بج رہے تھے۔ اور کیرتن ہو رہا تھا۔ اور ہزاروں جاتری ننگے پاؤں ہاتھ جوڑے ہوئے دھوتیاں سنبھالے ہوئے مورتی کے درشن کے لئے جا رہے تھے۔

مندر کے دور پیچھے روشنی کا لاوا اُبلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ یکایک آسمان پر رنگین ہوائیاں لہرائیں۔ کلیاں بکھریں، پھول کھلے، اور بارود کے انار رنگ رنگ کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے فضا میں گم ہو گئے۔

یہ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

فلپس نے کہا۔ دو مندروں میں مقابلہ ہے۔ یہ مندر جو تم اس چوک میں دیکھتے ہو یہ لوہے کے بیوپاریوں اور کالی مرچ کے بیوپاریوں کا مندر ہے وہ دوسرا مندر جو دوسرے چوک میں ہے جو یہاں سے نظر نہیں آتا۔ لیکن جہاں کی بہتر روشنی تم یہاں سے دیکھ سکتے ہو وہ ناریل کے سوتی کارخانے داروں کا مندر ہے۔ اور گذشتہ سات دن سے اس مندر اور اس مندر کی سجاوٹ کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ کبھی اس مندر کے بیوپاری بازی لے جاتے ہیں اور کبھی اس مندر کے بیوپاری ——

اور دونوں مندروں کے بیچ میں کلمریڈ مدیپا کی لاش ہے! میں نے آہستہ سے کہا! یکایک اس مندر کے تالاب کے اوپر سے آتش باز چھوٹی اور آسمان میں فوارے کی طرح بلند ہو کے ایک لطیف پھوار کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔

کالی مرچ کے بیوپاریوں نے اپنے دیوتا کی جے کا نعرہ لگایا اور دوسرے مندر کے کارخانے داروں نے اسی جوش و خروش سے جواب دیا۔ میرے ذہن میں یکایک ان دونوں مندروں کے بیچ مشعلوں کی قطار بھڑک اٹھی۔

میں نے فلپس سے کہا۔ چلو سمندر کے کنارے چلیں۔

سمندر کا شور بہت دھیما تھا اور ریت میں ابھی تک شام کی گرمی
ی۔ اور چاند کہیں نہیں تھا۔ اور تاریکی اس سرے سے اس سرے
ے پھیل چکی تھی۔ اور نمناک گھٹی ہوئی فضا میں اٹھ چلی بیڑیوں کی مرطوب
غ بو تھی۔ اور چاند کہیں نہیں تھا۔ اور ہم لوگ بہت دیر تک چاند کا
نظار کرتے ہوئے ٹہلتے رہے۔ لیکن چاند نہیں نکلا۔ صرف آسمان پر
مدروں کے کنگوروں سے پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔

آخر فلپس نے مجھ سے کہا۔ چلو دوست واپس چلیں۔ چاند خود
د نہیں آئے گا۔ اسے کھینچکر زمین پر لانا پڑے گا۔

وائیلورالپی سے بارہ چودہ میل کے فاصلے پر ہوگا۔ یہ گاؤں چرتل
تعلقہ میں ہے۔ اور چرتل تعلقہ میں مستقل قحط رہتا ہے۔ قحط بنگال کے دنوں
میں یہاں بھی شدید قحط پڑا تھا۔ اور بہت سا جانی نقصان ہوا تھا۔ قحط کے
علاوہ یہاں کے لوگوں میں میں نے فیل پا کی بیماری بہت عام دیکھی ہے۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ چرتل تعلقہ کے لوگ گندے جوہڑوں کا پانی پینے پر مجبور ہیں
گو الپی اس مقام سے بارہ چودہ میل دور ہوگا۔ اور شہر سے نل یہاں بھی
لائے جاسکتے ہیں۔ یا پائپ ویل کھدوائے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان باتوں
کی کسے فرصت ہے۔ ہمارا نیا آئین سلامت رہے۔ اس میں اگر اچھے ہونے
کی آزادی نہیں تو کم از کم بیمار ہونے کی آزادی تو ہے۔

وائیلور کا گاؤں ایک چھوٹا سا جزیرہ تو نہیں۔ جزیرہ نما ضرور ہے۔ اس کے
طرف پانی ہے۔ اور چوتھی طرف نڈم پاراکاڈ نامی گاؤں سے اس کی زمین
ہے۔ ہم لوگ چونکہ چیرتل کے راستے سے آئے تھے اس لئے ہمیں وائیلور
ہ کے لئے جیٹی سروس کا سہارا لینا پڑا۔ کوئی دو تین منٹ کے عرصے میں کشتی
، واٹرز کے گہرے سبز پانیوں کو چیرتی ہوئی ہمیں وائیلور کے ساحل پر
لگی۔

ساحل سے اور بھی بہت سی کشتیاں بندھی تھیں۔ اور چاروں طرف
ں کے درختوں کی گھنی قطاریں تھیں۔ اور ان درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے
روں کے گھروں میں سے ناریل کے ریشے کوٹنے والی عورتوں کی آوازیں
تھیں۔ شمال کی جانب سے دو بڑے بڑے ڈونگے مغرب کو جا رہے
ہوا ساکن تھی اور سمندر خاموش تھا۔ اور ڈونگے چلانے والے مانجھیوں
پکاریں ایک عجیب اندوہناک کرب اور درد چھپا ہوا تھا۔ ہم لوگوں
ی خاموشی اور کچھ جھجک سے ناریل کے درختوں کے نظارے سے پہلے
کے اندر جاتی ہوئی بھورے رنگ کی پگڈنڈی پر قدم بڑھائے۔ میرے ساتھ
تھا رفلیس پہلی بار وائیلور آیا تھا۔

وائیلور کے نام سے یوں تو ہندوستان کے اکثر سیاسی پڑھے لکھے
واقف ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ آج بھی یہ نہیں جانتے کہ وائیلور جنوبی
جلیانوالا باغ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جلیانوالا باغ میں ایک
کے حکم سے گولی چلائی گئی تھی۔ اور وائیلور میں ایک اپنے ہی ہم وطن کے حکم

سے قتل عام ہوا تھا۔ جس میں چار سو کے قریب وائیلور کے مزدور او
کسان آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے۔ اور سر سی پی راما سوامی آئر کے امر
دھان مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوتے شہید ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ
آج کل یہ بھول جاتے ہیں کہ ٹراونکور کے دیوان اگست ۱۹۴۷ء کے
بعد بھی اپنا ناتہ ہندوستان سے توڑ کر ٹراونکور کو برطانوی کامن ویلتھ
اندر ایک دوسری آزاد ڈومینین کا مرتبہ دینے کے لئے یہ سارا خون خ
کر رہے تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے اپنی مطلق العنانی کی دھوم
مچا رکھی تھی۔ اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہی ایسی کے مزدوروں
کسانوں اور پنا پارا کے کسانوں نے آزادی کی جدوجہد میں اپنا خون
بہایا تھا اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کے نیتاان شہیدوں کی بہادری،
جرات کو سراہتے تھے۔ اور انہیں قومی شہید کا مرتبہ دیتے تھے۔ آج و
کھل چکا ہے۔

پنا پارا کی جدوجہد کے تین چار روز بعد ہی وائیلور میں دوسرا م
بندھا۔ جس میں وائیلور کے جیالے مزدور اور کسانوں نے اپنے سینے
گوری سرکار کے کالے مہروں کی گولیاں کھائیں۔ اور اس جیداری اور بلند
سے وطن کے دشمنوں کا مقابلہ کیا کہ سامراجیوں کا سنگھاسن ایک لمحے
لئے ڈول گیا۔ اور سر سی پی کو ٹراونکور چھوڑتے ہی بنی اور کانگریسی حکو
برسر اقتدار آئی۔ آج میں اسی آزادی کے مندر وائیلور میں فلپس کے سا
آیا تھا۔

کچھ دور پگڈنڈی پر خاموشی سے چلنے کے بعد ہمیں ایک دبلا پتلا نوجوان
۔ اس کا نام وی۔ جی سدھاکرن تھا۔ یہ ایرناکلم کے ایک کالج میں پڑھتا تھا
ر یہاں چھٹیوں میں اپنے گھر وائیلور میں آیا تھا۔ اس نوجوان نے ہمیں
ارے وائیلور میں گھمایا۔ سب سے پہلے ہم اس کے گھر گئے۔ اس کی بیٹھک
، کیرلا کے مشہور سماجی مصلح شری نارائن کی تصویر لگی تھی۔ اور کیرلا کے مشہور
م پرست شاعر کمار آشان کی بھی بیٹھک میں ہمارے لئے تازہ ناریل کا
ی لایا گیا اور گھر کے بہت سے لوگ ہمیں دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔

پانی پی کر ہم لوگ گھر سے باہر نکلے چلتے چلتے سدھاکرن نے ایک چھوٹے
ے لڑکے سے کہا نل اور دمینتی کے لئے چوڑا ڈال دیا۔

لڑکے نے کہا۔ ہاں ابھی ڈالتا ہوں۔

میں نے پوچھا۔ یہ نل اور دمینتی کون ہیں؟

سدھاکرن نے آنگن میں کھدے ہوئے جوہر کی طرف اشارہ کرکے کہا
مچھلیاں ہیں۔ اس میں رہتی ہیں۔ ہم لوگ گھر کی مچھلیوں کو کبھی نہیں کھاتے۔

میں نے کہا۔ کاش کبھی سودیشی سرمایہ دار بھی اس پر عمل کریں۔

فلپس نے ہنس کے کہا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

گھر سے باہر نکلے تو پھر ساحل آگیا۔ ایک سیاہ فام لڑکا پھٹی پرانی جیل سی

دھوتی لپیٹے ایک چھوٹی سی کشتی میں کالا کیچڑ بھر کے لا رہا تھا۔ کنارے پر
بہت سی مکدر یہ گھاس اگی ہوئی تھی اس نے وہاں لا کے کشتی باندھ دی
کشتی سے کالا کیچڑ نکال کے ناریل کے درختوں کی جڑوں میں ڈالنے
میں نے سدھا کرن سے پوچھا۔ ایسا کیوں کرتا ہے۔

سدھا کرن نے کہا۔ یہ کالا کیچڑ ناریل کے درختوں کے لئے بڑی
کھاد کا کام دیتا ہے۔ کیوں بے شنگوئی! سدھا کرن نے اس کے شانے کو
لگا کے پوچھا۔ اب تو ہڈی میں درد نہیں ہوتا۔

شنگوئی نے دانت باہر نکال دیئے۔ بولا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ جب
سردی لگتی ہے۔ یا جب دو دن کا فاقہ لگتا ہے۔ سدھا کرن نے شنگوئی کا
میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ یہ شنگوئی ہے جب وائیلو رمیں گولیا
چل رہی تھیں۔ یہ گھبرا کے گھر سے باہر نکل پڑا اور ایک ناریل کے درخ
کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ آؤ میں تمہیں وہ درخت دکھاؤں۔

شنگوئی فلپس سدھا کرن اور میں اس درخت کے قریب گئے ج
شنگوئی اپنی جان بچانے کے لئے چھپا تھا۔ سدھا کرن نے شمال کی جا
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ گولی ادھر سے آئی۔ اور اس تنے کے اندر دا
ہوئی۔ اور دوسری طرف سے نکل گئی۔ اور پھر ناریل کے تنے سے لگے ہو
شنگوئی کے شانے کو چیرتی ہوئی زمین پر جا گری۔

جدھر سے گولی درخت کے تنے کے اندر داخل ہوئی ادھر اک با
چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جدھر سے باہر نکلی ادھر اک بہت بڑا سوراخ تھ

شنگو نی کے شانے پر بھی زخم کا بہت بڑا نشان تھا۔

میں نے کہا۔ جانے جب یہ گولی درخت کے تنے کے بجائے انسان کے سینے یا اس کے پیٹ میں گھستی ہوگی تو کتنا بڑا سوراخ کرتی ہوگی۔

فلپس نے کہا۔ ہاں گوشت اور لکڑی میں بہت بڑا فرق ہے۔ گو بہت سے شکاری اس فرق کو نہیں سمجھتے۔

میں نے کہا۔ جانتے تو یہ ہوں گے۔ لیکن شاید پرواہ نہیں کرتے۔

سدھاکرن نے کہا۔ سامراج کے فوجیوں نے ہمارے سینوں پر جو کارتوس استعمال کئے ہیں۔ سنا ہے اس سے پہلے وہ سور کے شکار کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔

شنگو نی ہنس کے کہنے لگا۔ میں جب اسپتال میں اچھا ہو گیا تو پولیس والوں نے مجھے بہت پیٹا۔ مجھ سے وائیلور کے مورچے پر لڑنے والوں کے نام پوچھتے تھے۔

میں نے کہا۔ میرا نام شنگو نی ہے ——— اور مجھے کسی دوسرے کا نام آتا ہی نہیں۔

اس کے بعد شنگو نی پھر کالا کیچڑ ناریل کی جڑوں میں ڈالنے لگا۔ میں نے سوچا۔ میرے وطن کی مٹی کس قدر زرخیز ہے۔ جہاں شنگو نی جیسے دلیر لوگ پیدا ہوتے ہیں۔

فلپس میں اور سدھاکرن گاؤں کے مندر کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں پنایرا کے مورچے کے بعد انقلابیوں اور آزادی کے متوالوں نے اپنا

کیمپ سجایا تھا۔

کوئی کلم مندر کے پاس واکیلور کے جانبازوں کا کیمپ تھا۔ یہ مندر اس وقت بالکل ویران حالت میں پڑا تھا۔ مندر کے پاس ایک کنداں تھا۔ لیکن کوئی یہاں پانی بھرنے کے لیئے نہیں آتا تھا۔ آس پاس کاٹجی رم کے اونچے اونچے درخت تھے۔ جن میں ارغوانی پھول لگے ہوئے تھے۔ ایک درخت سے بکری بندھی تھی۔ اور چراغوں کے دیئے اپنے گہرے داغدار سینوں میں ظلمت کی تاریکی لیئے خاموش کھڑے تھے۔

سدھاکرن نے کہا۔ یہاں ان کا کیمپ تھا۔ ان کے ہاتھ میں صرف دائرہ کنتم کے بھالے تھے۔ اور وہ لوگ یہاں پہ پڑاؤ کر رہے تھے۔ قریب کے گاؤں کے زمیندار نے جو آج کل مرکزی اسمبلی کا ممبر ہے۔ ان کی موجودگی کی خبر سی۔ پی کے فوجیوں تک پہنچادی۔

فوج کدھر سے آئی تھی۔ میں نے پوچھا

سدھاکرن نے کہا۔ شمال کی جانب سے وہ ادھر جہاں سرکاری مہمان خانہ ہے۔ ادھر سے فوجیوں کی کشتیاں آکے ہمارے گاؤں کے ساحل پر رکیں اور آتے ہی انہوں نے فائر کرنا شروع کردیا

میں نے پوچھا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔

سدھاکرن نے کہا میری والدہ سخت بیمار تھیں۔ گاؤں کے سارے لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ یا کیمپ میں داخل ہوگئے تھے۔ میری ماں سخت بیمار تھیں۔ اس لئے مجھے گھر پر ان کے سرہانے تیمارداری کے لیئے رہنا پڑا۔

پھر کیا ہوا

سدھاکرن نے کہا۔ جب گولی چلنی شروع ہوئی۔ میں اس وقت اپنی
ماکو دوا پلا رہا تھا۔ میں نے شمال کی جانب سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اور جنوب
طرف سے جہاں ہمارا کیمپ تھا۔ ادھر سے انقلاب زندہ باد کی آواز سنی۔
آواز ہزاروں سینوں سے گونج کر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پھر زور سے
لیوں کی باڑھ سنائی دی۔ اور اس میں سے پھر انقلاب زندہ باد کا نعرہ
چھل کر ادھر آگیا۔

پھر۔۔۔؛

سدھاکرن نے آہستہ سے کہا۔ ساڑھے چھ گھنٹے گولی چلتی رہی۔ اور
ں انقلاب زندہ باد کا نعرہ سنتا رہا۔ آہستہ آہستہ یہ نعرہ مدھم ہوتا گیا
ہستہ آہستہ اس کی آواز میں کمی ہوتی گئی۔ گولیوں کی باڑھ بڑھتی گئی۔ آخر
ں صرف ایک آواز سنائی دی۔ انقلاب زندہ باد اور اس کے بعد چاروں
رف ایک لمبی طویل نہ ختم ہونے والی خاموشی چھا گئی۔ اور میری ماں بستر پہ
ہ چھپا کے سسکنے لگی۔

اس رات ونجلور میں کوئی نہ تھا۔ کوئی روتا نہ تھا۔ کوئی سسکی نہ
رتا تھا۔ فوجی بھی چلے گئے تھے۔ کتے بھی خاموش تھے۔ پرندے بھی چپ

تھے۔ ایسا سناٹا ایسی خاموشی، اتنی طویل رات میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تاریکی کبھی ختم نہ ہوگی۔

دوسرے دن دوپہر کو میں گھر سے باہر نکلا۔ چاروں طرف ایک عجیب بھیانک منظر تھا۔ شہیدوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ درختوں سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ جوہڑوں میں پڑی تھیں۔ جھاڑیوں میں الجھ گئی تھیں۔ کسی کا سر کہیں تھا۔ بازو کہیں، ٹانگیں کہیں۔ آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں اور کوّے شور مچا رہے تھے۔ اور کتّے لاشوں سے گوشت نوچ رہے تھے۔ شہید کیمپ سے آگے بڑھے ہوئے گولیاں کھاتے ہوئے ساحل کے قریب آگئے تھے۔ کیمپ سے لاشوں کا لمبا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کیمپ کے قریب پچاس ساٹھ لاشیں پڑی تھیں۔

تین قدم آگے

تیس چالیس لاشیں

چار قدم آگے

بیس پچیس لاشیں

پانچ قدم آگے

پندرہ بیس لاشیں

چھ قدم آگے

آٹھ دس لاشیں

سات قدم آگے

چار پانچ لاشیں
آٹھ قدم آگے

ایک لاش - جس کے ہاتھ میں مزدوروں اور کسانوں کا جھنڈا تھا - اپنی مٹھی سے جھنڈے کو بلند کیے ہوئے پڑی تھی - لاش گولیوں سے چھلنی تھی - اور جھنڈا بھی لیکن مٹھی ابھی تک اسی مضبوطی سے بند تھی - اور صرف دو قدم پر سمندر تھا - وہ سمندر جو ہر آنے والے طوفان کا پتہ دیتا ہے - سدھاکرن چپ ہو گیا - میں نے مندر کے چاروں طرف دیکھا - اور سدھاکرن سے پوچھا - یہ مندر ویران کیوں ہے - اس مندر میں اب کوئی چراغ کیوں نہیں جلاتا -

سدھاکرن نے کہا - اب گاؤں والوں کا پتّل کے پرانے خداؤں میں اعتقاد نہیں رہا - اب کوئی بیوہ یا سہاگن یہاں آکے چراغ نہیں جلاتی گاؤں والے کہتے ہیں ہم نے ہزاروں سال دیول کی پوجا کی - لیکن وقت پڑنے پر بھی یہ ہمارے کام نہ آیا -

سدھاکرن آگے آگے چلنے لگا - ہم اس کے پیچھے ہو لئے - ایک بڑے سے جوہڑ کے پاس پالا کا ایک بڑا سا درخت کھڑا تھا - جس کے پتے پھیلی ہوئی ہتھیلی سے مشابہ تھے - جوہڑ میں سبز پتوں والی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان پر اودھم کے لال لال پھول کھلے ہوئے تھے -

سدھاکرن اس جوہڑ کے قریب رک کر کہنے لگا - اس جوہڑ میں پینتیس شہیدوں کی لاشیں دفن ہیں -

میں اور فلپس بہت دیر تک یہاں چپ کھڑے رہے
آخر میں نے جھک کر اوڈم کا ایک سرخ پھول توڑ لیا ۔ اور فلپس سے کہا بہت عرصہ ہوا میں نے ایک کہانی لکھی تھی ۔ پھول سرخ ہیں ۔ اس کہانی میں ایک ننھا شاعر جو مزدوروں کی ہڑتال کے دوران پولیس کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ مرتے ہوئے مجھ سے پوچھتا ہے " بھیا میری قبر پر سرخ پھول کب کھلیں گے " آج میں اس ننھے شاعر سے کہنا چاہتا ہوں ۔ چھوٹے بھیا ۔ میں ان سرخ پھولوں کو وائیلور میں کھلتے ہوئے دیکھ آیا ہوں ۔
فلپس نے بھی اوڈم کا ایک سرخ پھول توڑ کر ہاتھ میں لے لیا ۔
سدھاکرن ہمیں آگے لے چلا ۔ یہاں مٹی کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا
سدھاکرن نے کہا ۔ اس ڈھیر کے نیچے ایک سو بیس لاشیں دفن ہیں ۔
چلتے چلتے میرا پاؤں اس ڈھیر سے ٹکرا گیا ۔ تھوڑی سی خاک اڑی ۔ اور ڈھیر کے اندر سے دو تین ہڈیاں باہر نکل آئیں ۔ میں نے پوچھا ۔ یہ کیا ہے ۔
سدھاکرن نے کہا " یہ شہیدوں کی ہڈیاں ہیں "
مگر انہیں اچھی طرح سے دفن کیوں نہیں کیا گیا ۔
سدھاکرن نے کہا ۔ تیسرے دن فوجی آئے تھے ۔ انہوں نے پٹرول ڈال کے انہیں جلانے کی کوشش کی کچھ لاشیں جل گئیں ۔ کچھ ایسے ہی رہیں پھر فوجی چلے گئے ۔ اور ساتویں روز ادھر ادھر کے لوگ وائیلور میں آئے لیکن چار سو لاشیں تھیں ۔ کوئی انہیں کیسے جلاتا ۔ کیسے دفن کرتا ۔ پھر ان میں سے

کوئی ہندو تھے۔ کوئی مسلمان، کوئی عیسائی اور کون کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ ٹانگ ہندو ہے، یہ سر عیسائی ہے۔ یہ دل مسلمان کا ہے۔ ہم نے سب کو اکٹھا کرکے جلدی سے ان مٹی کے ڈھیروں میں دفن کر دیا۔

تو اب ان ڈھیروں کے ارد گرد کم ازکم باڑھ ہی باندھ دو تاکہ کسی کے پاؤں کی ٹھوکر سے یہ ہڈیاں باہر تو نہ نکل سکیں۔

سدھاکرن نے مسکرا کر کہا۔ ہم ہر سال وائیلور کے شہیدوں کا دن مناتے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے ان ڈھیروں کے ارد گرد باڑھ باندھ دی تھی۔ اور ڈھیروں کے اوپر مزدوروں کا جھنڈا بھی لگایا تھا۔ لیکن پولیس نے وہ جھنڈا بھی اکھاڑ پھینکا اور باڑھ بھی کھود کے الگ کر دی۔ ہمارے نیتاؤں کو اب وائیلور کے شہیدوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ انھیں حاصل کرنا تھا وہ کر چکے لیکن — لیکن میں نے جھلا کے کہا وائیلور کے شہید سارے کیرلا کے شہید نہیں ہیں کیا؟ سدھاکرن نے کہا جن لوگوں نے کیرالا کی دھرتی کو بیچ کھایا ہے۔ وہ اس کے شہیدوں کی رکھشا کیا کریں گے۔ وہ تو ان شہیدوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ آج وہ زندہ آدمیوں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا وائیلور کے مُردوں سے ——

سدھاکرن نے ہمیں دو ایسے اور بڑے بڑے ڈھیر دکھائے جن میں ایک سو زیادہ شہید دفن تھے اسکے بعد وہ ہمیں مانکیا کے گھر لے گیا۔ مانکیا کا ایک ہی بیٹا تھا۔ شری دھر، اور وہ ایک آئیل مل میں کام کرتا تھا۔ اور وائیلور کی لڑائی میں شہید ہوا تھا۔

جب ہم مانکیا کے گھر پہنچے تو وہ ہمیں دیکھ کر دیوار سے لگ کے کھڑی ہو گئی۔

اس طرح کہ میں اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔
میں نے مانکیا سے پوچھا۔ تم شری دھر کی ماں ہو؟
سدھاکرن نے ترجمہ کیا۔
مانکیا نے پلٹ کے ایک دفعہ میری طرف گھور کے دیکھا۔ پھر اس نے دیوار کی اوٹ میں اپنا منہ چھپالیا۔ اگر اسکی آنکھوں میں آنسو ہونگے۔ تو میں نے نہیں دیکھے۔ عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ میرے دل میں ایک عجیب سا طوفان اٹھ آیا تھا۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کرکے پتھر کے چبوترے پہ کھڑے ہو کے اس چھوٹے سے گھر کو دیکھا۔ یہاں کبھی شری دھر رہتا تھا۔ اور جہاں آج کل اس کی ماں، اور اس کی چھوٹی بہن تنگما رہتی ہے۔ میں نے تنگما کو گود میں اٹھا کے پوچھا بھیا تجھے کیا کھلاتا تھا۔
تنگما نے کہا۔ مچھلی!
مانکیا نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ اور کہا ہم لوگ شامی کباب کھائیں گے
مانکیا نے اتنا کہہ کے پھر منہ پھیر لیا۔ ماں کیا تو مجھے غیر سمجھتی ہے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا، مانکیا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے حیران ہو کے چاروں طرف دیکھا اس گھر کے آس پاس ناریل کے پیڑ بھی زیادہ نہیں تھے۔ دیوار کے باہر ناریل کے پیلتے بننے تکیوں پر زنگ چڑھ چکا تھا۔ تنگما حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔
میں نے مانکیا سے کہا۔ ماں۔ تیرا بیٹا شہید کی موت مرا۔ کیا تجھے اس پر فخر نہیں
مانکیا نے جھلا کر کہا۔ میں کیا جانوں وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔
میں سدھاکرن اور فلپس وہاں سے سر جھکائے واپس ہوئے۔ رستے میں ایک توڑ آتا تھا اسے عبور کرنے کے لئے ہم رک گئے۔ اور اپنے جوتے اتار کے ہاتھ میں

نے لگے۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے آکر میرا کندھا زور سے پکڑ لیا۔ میں نے گھوم کے دیکھا
انکیا تھی۔ اور اس کا چہرہ سرخ تھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔
کیا ہے؟ میں نے حیران ہو کے پوچھا۔
مانکیا نے بڑی تیزی سے کہا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اور زور زور سے اشارے کر رہی تھی۔

آھن ارو نالیا کائے ریتو وینڈی آنا مارکا چل
(میرا بیٹا ایک اچھے کاز کے لئے مارا گیا ہے)
اینڈرا موا نے پیئی انی کیا مانم انڈا
(مجھے اس پر فخر ہے)

مانکیا اتنا کہہ کے واپس اپنے گھر کو تیزی سے بھاگ گئی۔
یکایک فلیس کا چہرہ روشن ہو اٹھا۔ ماں تجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ لیکن ہمیں
ی ایسی ماں پر فخر ہے۔
لیکن مانکیا نے سنا نہیں۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

مانکیا کے گھر سے ہو کے ہم لوگ نارائن کے گھر گئے۔ رستہ میں ایک کھلی جگہ میں
رہ بیس ادھیڑ اور بوڑھی عورتیں ناریل کے ریشے کوٹ رہی تھیں۔ جب انہوں
ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا تو ذرا تھوڑی دیر کے لئے رک گئیں۔ پھر اپنا کام کرنے
ں۔ ان عورتوں کے جسم پر کمر کے سوا اور کہیں کوئی کپڑا نہ تھا۔ جب میں نے سدھا
ن سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ غریبی اور پرانے زمانے کی جہالت۔ نئی
ں کی لڑکیاں اب اپنا جسم اچھی طرح ڈھکنے لگی ہیں۔ لیکن یہ پرانے زمانے کی بوڑھی

مائیں اب کیسے بدل سکتی ہیں اور در اصل عریانی تو نگاہ میں ہوتی ہے۔ جسم میں نہیں ہوتی۔
اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم نارائن کے گھر پہنچ گئے۔ نارائن کا رنگ سیاہ ہے جسم کمزو
دانت بیحد سفید مسکراہٹ روشن اور چہرہ ذہین نارائن وائیلو رکے مورچے میں شر
تھا۔ اور جھنڈا ایکے آگے چلنے والوں میں تھا۔ گولی کا نشان اس نے مجھے دکھایا۔ گو
دائیں طرف سینے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی پشت پر سے نکل گئی تھی۔

پیشتر اس کے کہ میں نارائن سے کچھ پوچھ سکوں۔ نارائن نے مجھ سے پوچھا۔ یہ
آپ کی کانفرنس کی رپورٹ آج کے اخبار میں دیکھ رہا تھا۔ حیرت ہوتی ہے یہ جا
کہ ابھی تک آپ کے ہاں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عوام
ادب پر لکھنے کا کوئی حق نہیں۔

نارائن نے کہا۔ کیا ادب پر میرا کوئی حق نہیں ——— اب تو مجھے یہ تا
ہو گیا ہے۔ اس لئے میں کانفرنس میں نہ آسکا اور نہ میں ادبی منافع خوروں کی خ
خبر لیتا۔ جو ادب کی ٹھیکیداری کرتے ہیں۔ اور اسکا امیر طبقہ میں نیلام کرتے ہیں۔

میں نے کہا۔ نارائن۔ میں تم سے براہ راست دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ جواب دو گے

نارائن نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ تم نے وائیلو کی لڑائی لڑی۔ اپنا خون دیا۔ لیکن اس جدوجہد کا
فائدہ کسی دوسرے جابر طبقہ کو ہوا۔

نارائن نے کہا۔ حالات ہی ایسے تھے۔ اس وقت اس منزل ہی سے گذرنا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ان حالات نے تمہیں بزدل تو نہیں بنا دیا۔

بزدل ہو کے کہاں جائیں گے۔

میں نے پوچھا۔ اچھا اگر تم غداروں سے مل جاتے تو آج بڑے مزے میں ہوتے۔
کب تک؟ نارائن نے فوراً جواب دیا۔ جیسے میرے منہ پر زور کا طمانچہ مار دیا ہو۔
میں نے پوچھا۔ ادیبوں کے نام کوئی پیغام دو گے۔
اس نے بڑی دلجمعی سے کہا "ہاں ان سے کہنا میں COIR FACTORY
لوئر فیکٹری میں کام کرتا ہوں میرے متعلق لکھنے سے پہلے مجھ سے مل لیا کریں"

نارائن کے گھر کے اندر سے نکل کے ہم لوگ آنگن میں کھڑے ہو گئے اتنے میں سدھا کرن نے ایک بوڑھی عورت کی طرف اشارہ کرکے کہا "کامریڈ، یہ پاروہے شہید پربھاکرن اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس عورت کو اسی برس کی عمر میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے ناریل کوٹنے کا کام کرنا پڑتا ہے"۔

بوڑھی ماں پارو مجھے دیکھ کے آگے بڑھی۔ اور میرے سامنے آکے ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کو دیکھ کے کانپے اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں کو دیکھ کے ڈبڈبا گئیں۔ اور وہ چلتے چلتے میرے سامنے آکے رک گئی۔ اور وہ لمحہ رک گیا جیسے کبھی کبھی کوئی لمحہ آکے رک جاتا ہے۔ اور وقت آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور مجھے اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود اس لمحے میں میں اس کے سامنے اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میری رقیق جذباتیت تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں جذباتی گدھا ہوں اور عملی زندگی سے قطعاً بے بہرہ ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ کہنا ہے کہ میں ہزار کوشش کے باوجود اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں نہیں روک سکتا ——

شاید میرے دل میں ابھی وہ اندھی نسطائیت نہیں پیدا ہوئی جو انسان کی شہادت پر بھی پتھر کی طرح ساکت رہتی ہے۔ یا اسی قدر بددیانت ہو جاتی ہے کہ چار سو انسانوں کے خون کا بار لیتے ہوئے بھی مدراس ریڈیو پر آرٹ اور لیچر پر تقریر کرنے لگتی ہے۔ میں کرتا ہوں کہ میں ایسا بہادر نہیں ہوں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ میں ایک معمولی کمزور انسان ہوں جو یاروں کے سامنے رو دیا۔ اس طرح رو دیا جس طرح بچہ اپنی ماں کے سامنے روتا ہے۔ اور وہ اس طرح روئی جس طرح ماں اپنے بچے کے سامنے روتی ہے اور فریاد کرتی ہے۔ کیونکہ وہ میری زبان نہیں جانتی اور میں اس کی زبان نہیں جانتا۔ لیکن ہمارے آنسو ایک دوسرے کی زبان جانتے تھے۔ انسانیت کی زبان انسان کے عمل اور جد و جہد کی زبان اس کا تسلسل۔ اس کی کاوش اور شہادت کی زبان میں ان آنسوؤں کو کہاں چھپاتا۔ کیسے کہتا کہ میری آنکھوں کا پانی مر گیا ہے! اور میرے دل کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اور میں شہید کی ماں کے سامنے بھی پتھر بن کے خاموش کھڑا رہ سکتا ہوں۔ کوشش تو میں نے بہتری کی تھی۔ لیکن یہ دو آنسو جانے کتنی آہنی دیوار کو چیر کر سامنے رخساروں پر آ گئے۔ یہ غم غصے اور طوفان کے آنسو جو شہید کے مزار پر سرخ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں۔ ادب میں خون کے قطروں کی طرح ٹپکتے ہیں۔ اور مضبوط ہاتھوں میں انقلاب کی شمشیر بن جاتے ہیں۔ میں ان آنسوؤں کے لئے شرمندہ نہیں ہوں۔

جب ہم وائیلور پہنچے تھے تو چند ایک کے سوا کسی کو ہماری آمد کی خبر نہیں تھی۔ لیکن جب ہم وائیلور سے رخصت ہونے لگے۔ تو سارا گاؤں اپنے ساتھ تھا آ گئے آگے چھوٹے چھوٹے بچوں کا جم غفیر تھا۔ جو ننگ دھڑنگ ناچتے کودتے ہوئے

ہمیں ادھر لیجا رہے تھے جدھر عرتلا جانے کے لئے کشتیاں بندھی تھیں۔
ایک چھوٹا سا بچہ آگے آیا۔ اس کے جسم پر کچھ نہیں تھا۔ صرف کمر پر ایک کالا دھاگا لپٹا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کے اپنے ہاتھ آگے بڑھانے۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کا ایک ہار ہے۔ جیسے بالس کی دو تیلیوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ یہ ہار اس بچے نے میرے گلے میں ڈال دیا۔ اور دوسرے بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے

میں نے بچوں کو مٹھائی کے روپے دینے کی نیت سے جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ان سے پوچھا۔

"بچو! تم کیا چاہتے ہو؟"
ایک لمحہ کے توقف کے بعد

ہار ڈالنے والے بچے نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا "ہم امن چاہتے ہیں"
میں حیرت سے اس بچے کی جانب دیکھنے لگا۔ اور اسی وقت دوسرے بچے زور زور سے چلا کے کہنے لگے ہم امن چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں۔
میں نے اپنا خالی ہاتھ جیب سے خالی نکال لیا۔ اور چپ چاپ کشتی میں بیٹھ گیا۔ بچے وائیلور کے ساحل پر کھڑے تھے۔
کشتی بیک واٹرز کے پانیوں میں سے گذر رہی تھی۔ ہلکی ہلکی لہروں پر ہنڈولے سی تھی۔ میں نے ہار اتار کے آہستہ سے سمندر کے پانی پر چھوڑ دیا ہار تھوڑی دور تک تیرتا رہا پھر بالس کی دونوں تیلیاں الگ ہو گئیں۔ اور تیلیوں میں پروئے سرخ پھول اس طرح لہروں پر مچلنے لگے جس طرح بچے کشتی میں بیٹھ کر سیر کو جا رہے ہوں۔ ایک

تیلی مشرق کو جا رہی تھی۔ اور دوسری تیلی مغرب کو اور میں انھیں دیکھتے ہی دیکھتے
ایک کہانی سوچنے لگا۔ اور ان ننھے ننھے پھولوں سے کہنے لگا۔

مشرق کو جانے والے ننھے ننھے معصوم پھولو جب تم مشرق کو جاؤ گے تو کا
سے ضرور گذرنا۔ جہاں ہندوستان کی سچی آزادی کی تڑپ سے بے قرار ہوکر تم
پانچ ماؤں نے اپنی جان قربان کر دی ہے۔ کلکتہ سے گذر کے رنگون سے ہوتے ہو
جانا جہاں برما کے چاول چٹیاروں اور چرچلوں کی سازش کے خلاف لڑ رہے
ہیں۔ رنگون سے آگے چلو گے تو تمہیں آبنائے ملایا ملے گی۔ اور اسکے ساحلوں
تمہیں ملایا کے گوریلا سلام کریں گے۔ یہ گوریلا اس لئے نہیں لڑ رہے ہیں کہ انہیں
انگریزوں سے نفرت ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ملایا کی ٹن کی کانوں اور ملایا کے ر
اور چائے کے باغوں کی دولت کو ملایا کے لوگوں کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں
اور اسے اپنے ملک کی بہبودی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ملا
کے گوریلا لوگوں کا سلام ضرور قبول کرنا۔ پھر وہاں سے گذرتے ہوئے تم سیگا
پہنچ جانا۔ جہاں بندر چینی اور ہوچی منہ کے سچے قوم پرستوں نے امریکی سامراج
بحری توپوں کے سامنے اپنے سینے کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ اور توپیں انہیں
سینوں کی جرأت سے ڈر کر بھاگ گئی ہیں۔ پیارے پھولو۔ ان بہادر سپاہ
کا پیام بھی سن لینا۔ اور پھر آگے شنگھائی کی جانب چلے جانا رستے میں تمہیں چیا
ڈبانے کی کوشش کریگا۔ کیونکہ چیانگ کو بہادر پھولوں سے بڑی نفرت ہے

بانگ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بانس کی تیلی میں پروئے
رئے پھول کبھی نہیں ڈوبتے۔ اس لئے تم صحیح وسالم شگفتہ و تازہ شنگھائی پہنچ
اؤ گے۔ اور جب تم شنگھائی پہنچو گے۔ تو سارا شہر اور اس کے بیڑ باجے
رسارے چینی اور ان کا سردار ماؤزے تنگ تمہاری زیارت کو آئیں گے۔
ن کا سلام بھی قبول کرنا۔ کیونکہ یہ لوگ بھی امن چاہتے ہیں۔

شنگھائی سے پھر تم ولاڈی واسٹک چلے جانا۔ ولاڈی واسٹک جو روس
ں ہے۔ روس جو مزدوروں اور کسانوں کا دیس ہے جہاں ایک بڑا آدمی رہتا ہے
ے پھولوں اور بچوں اور اس لئے امن سے بڑی محبت ہے۔ اس کا نام سٹالن ہے
ہاں پر روسی بیڑہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اور لوگ کبھی تمہیں ہوائی جہازوں میں سیر
رائیں گے۔ اور کبھی دخانی کشتیوں میں گھمائیں گے۔ اور کبھی رینڈ یر کی برف گاڑی
ں بٹھا کر تمہیں بحیرۂ منجمد شمالی سے آرک ایکٹک تک لے جائیں گے۔ وہاں سے تم
طب شمالی کے مرکز تک چلے جانا۔ اور گو وہاں برف کے سوائے اور کوئی نہیں رہتا
ہے۔ لیکن برف کو بھی امن کی ضرورت ہے۔

قطب سے ہو کے جب تم آئیس لینڈ کو جاؤ گے تو تمہیں امریکی جنگ بازوں کا
ا ملیگا۔ جو جپانگ کے مالک ہیں۔ یہ لوگ پھر تمہیں دبانے کی کوشش کریں گے۔ اور
ہارا تعاقب لنڈن تک کریں گے جہاں بندرگاہ پر کام کرنے والے مزدور تمہیں اپنے
ضبوط بازوؤں کی قوت سے بچائیں گے۔ تم ان کا سلام بھی قبول کرنا کیونکہ مزدور
ن کی سب سے بڑی قوت ہیں۔

پھر جب تم جبرالٹر پہنچو گے تو دونوں ساحلوں سے سپین اور افریقہ کے ساحلوں

سے تم پر گولیاں چلیں گی۔ لیکن تم گھبرانا نہیں۔ اسپین میں تمہارے بڑے
والے موجود ہیں۔ اور افریقہ کے ساحلوں پر تمہارا خیر مقدم کرنے کے
لاکھوں امن پسند کھڑے ہوں گے۔ پھر شاید عین اس وقت جب فرانکو
اور امریکی جہاز تم پر غالب آنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ کوئی مراکش
کوئی پال رابسن کا عزیز بھائی تمہیں سمندر کی لہروں سے اٹھا کے اپنے
لگالے لگا۔ اور تم اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔

اور میں نے دوسری سمت دیکھ کے کہا۔

اے مغرب کی سمت جانے والے پھولو۔ تمہیں عدن کے بہادر جہ
کا سلام پہنچے۔ سویز اور سکندریہ کے وطن پرستوں کی دعائیں تمہارا ساتھ د
سیریئن کے مجاہدوں کے ولولے تمہارا حوصلہ بڑھائیں، کیونکہ وہ لوگ بڑ
ہیں اور آج تک اپنے جزیرہ میں انگریزی بیڑے کے اڈے کے خلاف لڑا
ہیں۔ سائپرس سے ہو کے تم قسطنطنیہ چلے جانا۔ اور ترکی حکومت سے چلا
ناظم حکمت، اور دوسرے ترقی پسندوں کو رہا کر دو، کیونکہ ناظم حکم
امن ایک شعر کے دو مصرع ہیں۔ شاید کریٹ بھی دم نہ لینے دیگا۔ کیونکہ د
پھانسی کے پھندے پر جھول رہا ہے۔ جس نے ارسطو اور سقراط کو جنم د
تمہیں کوئی ترلیستہ کے ساحل پر بھی قدم نہ رکھنے دیگا۔ جہاں تین قوموں کے
جمع ہیں۔ شاید اطالوی ساحل کے کنارے کنارے بھی تمہیں کوئی ٹکنے
جہاں یورپ نے سرخ پھولوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔ لیکن جب تم سسلی
کر ملان پہنچو گے تو لاکھوں اطالوی جہازی اور مزدور یک زبان ہو کر تمہا

گے۔ اور کوئی بہادر سپاہی دشمنوں کی آبدوز کشتیوں اور بڑے بڑے
ں بحری جہازوں کے حملوں سے بچاتا ہوا تمہیں زور سے اپنے سینے
لگائے گا۔ اور تمہیں خوشی خوشی اپنے گھر لے جائے گا۔ اور تمہیں وہاں
دے گا جہاں اس کی یونین کا کارڈ رکھا رہتا ہے۔

اور پھر ایک روز یہ اطالوی جہازی اور وہ مراکشی حبشی دونوں روم
ں گے۔ روم جو پوپ ڈالس کا شہر نہیں ہے۔ روم جو پوپ الگٹس کا شہر ہے
جو نیرو کا شہر نہیں ہے بلکہ سیرو کا شہر ہے، روم جو الخطاطپرست عیسائیوں کا
ہیں ہے بلکہ شروع کے عیسائیوں کا شہر ہے جو انسان کی عزت اور اسکی ترقی
شہید ہوئے تھے۔ اسی روم میں امن کانگریس کے موقعہ پر ایک اطالوی جہازی
ایک مراکشی حبشی سرخ پھول سینے سے لگائے ہوئے ایک دوسرے سے ملیں گے
یعن اسی لمحے میں بالس کی دونوں تیلیاں جڑ جائیں گی۔ اور ہار مکمل ہو جائیگا
روم کی امن کانگریس میں وائیلڈر کے بیٹوں کا سندیسہ پہنچے گا۔ ہم امن چاہتے
۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں۔

اور اس پیغام کو ساری دنیا کی مائیں سنیں گی۔ کیونکہ گو دنیا میں سب بچوں
بیٹں الگ الگ ہیں۔ لیکن ان سب کی ماتا ایک ہے۔

اور اس پیغام کو سارے ملکوں کے درخت سنیں گے۔ کیونکہ گو سارے
ں کے جھنڈے الگ الگ ہیں لیکن ان سب کی مٹی ایک ہے۔

اور اس پیغام کو سارے سمندروں کے ماہی گیر سنیں گے۔ کیونکہ گو سارے
دروں کے نام الگ الگ ہیں۔ لیکن ان سب کا پانی ایک ہے۔

اور یہ ساری مائیں اور سارے درخت اور سارے ماہی گیر مل کے گر
ہوئے لہجے میں کہیں گے ۔
ہم امن چاہتے ہیں ۔ ہم امن چاہتے ہیں ۔ ہم امن چاہتے ہیں ۔

میں نے مسکرا کر پھولوں کی طرف دیکھا ۔ جو لہروں پر اس طرح چمک ر
تھے جیسے سمندر نے شاہی تاج پہن لیا ہو ۔ فلپس نے مجھ سے کہا ساتھی بچے
سلام کر رہے ہیں ۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے وائیلور کے ساحل پر کھڑے ہوئے
کو سلام کیا ۔ کشتی کے ڈنڈے زور زور سے ہلنے لگے ۔ کشتی دوسرے کنا
کو بھاگتی گئی ـــ کانوں میں ناریل کے کوٹنے کی صدا تال بن کے آنے لگی او
وائیلور کے ساحل پر سے شہیدوں کی ماؤں کا مدھم میٹھا ، پرسوز گیت چا
طرف پھیلتا گیا ۔

اویرم یان ناڈاگے ۔ پٹرم یان اروپتن
اوپرنائن اے کی یان اویرم ونیڈم !

" ہم پھر آئیں گے ...... ہم پھر آئیں گے اور انسان کی نئی روح
ساری دنیا پہ چھا جائیں گے ۔"

MANSOOR BROTHERS.
No.............................
LIBRARY
Delhi Colony. KARACHI.